الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اگر آپ بولنا نہیں جانتے تو چپ رہنا جانئے
کیوں کہ چپ رہنا بھی ———
اتنا ہی بڑا کام ہے جتنا کہ بولنا

جولائی ۱۹۸۵
شمارہ ۱۰۴

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	2/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
حقیقت حج	2/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
راز حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۴

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دوسو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لئے ایک ایسی زلزلہ خیز دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔

وہ ایک ناقابل بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے۔ وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ نئے رخ پر چلنے لگتی ہے۔ اس کا عمل کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو دیکھ لے۔ جو قیامت کی ترازو کھڑی ہونے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت کی ترازو پر کھڑا ہوا محسوس کرنے لگے۔

مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن پر جو کچھ قیامت میں گزرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ غیر مومن جو کچھ آخرت میں دیکھے گا وہ مومن اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ غیر مومن کل کے دن جو کچھ مجبور ہو کر مانے گا اس کو مومن آج کے دن کسی مجبوری کے بغیر مان لیتا ہے۔

خدا کا بندہ

بجلی کے بلب کا کنکشن ایک پاور ہاؤس سے جڑنا کوئی عام قسم کا واقعہ نہیں۔ یہ ایک غیر روشن چیز کا ایسی چیز سے جڑنا ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتی ہے۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک "مردہ" بلب "زندہ" بلب بن جاتا ہے۔ ایک تاریک بلب میں روشنی کا فوارہ پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ بندے اور خدا کے تعلق کا بھی ہے۔

خدا ہماری دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لئے خدا کو پانا محض سادہ سا واقعہ نہیں۔ یہ نفسیات انسانی میں پیش آنے والا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ یہ ایک بھونچال ہے جس سے آدمی کا پورا وجود ہل جاتا ہے۔ یہ ایک سیلاب ہے جس سے آدمی کی پوری شخصیت نہا اٹھتی ہے۔ خدا کو پانے کے بعد کوئی شخص ویسا نہیں رہتا جیسا وہ خدا کو پانے سے پہلے تھا۔ خدا کا مومن وہ ہے جو اس کے بعد ایک نیا انسان بن جائے۔

خدا کو پانا جس کو شریعت کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے، کسی انسان کے لئے اس کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ہے۔ خدا پر ایمان یہ ہے کہ ایمان آدمی کو اس طرح ملے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ وہ ایسی روشنی ہو جس سے اس کا پورا وجود چمک اٹھے۔ وہ ایسا رنگ ہو جس میں اس کے سارے معاملات رنگے ہوئے نظر آئیں۔

ایمان خدا کی موجودگی کو پالینے کا دوسرا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمتوں میں گم ہو جائے۔ وہ احساس خداوندی میں سرشار ہو جائے۔ ایمان آدمی کے جذبات کا حد خداوندی میں ڈھل جانا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان ایک زلزلہ ہے جو خدا کی معرفت سے آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ ایمان ایک سیلاب ہے جو خدا کے فیضان کو پاکر آدمی کے سینہ میں بہہ پڑتا ہے۔ ایمان خدا کو پالینا ہے اور خدا کو پانا سب کچھ کو پانا ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو خدا کو پانے کے بعد آدمی کو نہ ملے۔

Instant Response

Modern communiction has reached the sophistication of computerised telephone systems in the developed countries.

In a good many towns in the US, for instance, a system called "enhanced 911" has been installed. The number 911 has to be dialled in that country in an emergency for the caller to summon help.

With enhanced 911, a telephone company is now able to trace the originating number of the call and the caller's address instantly even without the caller saying a word! Such instant tracing has already led to timely help in a number of cases in which the callers were not able to say where they were called from.

It has been possible for some time to trace calls quickly. But it has been only in the last year or so that completely integrated systems, in which numbers can be immediately identified and converted to addresses, could be installed in small and medium-sized towns.

This has been possibe thanks to a sharp drop in computer prices. Even New York now wants to install one. They system's computer is so efficient that after tracing the call it can itself determine whether the emergency relates to the city's police, fire or ambulance department.

In Orlando, Florida, a panic-stricken woman caller dialled 911 but could not say a word before hanging up. Gunshots, however, were clearly audible. Within minutes police cars were on their way to the correct address and the culprit — an enraged gun-toting relative to the woman — was apprehended.

In another case, a deaf and dumb person could summon help in similar fashion in an emergency.

The Times of India, (New Delhi) April 16, 1985

ایک لمحہ میں

ترقی یافتہ ملکوں میں اب ایسے ٹیلیفون استعمال ہو رہے ہیں جن کے ساتھ کمپوٹر کا پیچیدہ نظام وابستہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مواصلات کا نظام بالکل نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے بہت سے شہروں میں ایک نیا ٹیلیفون سسٹم پچھلے ایک سال کے اندر رائج ہوا ہے۔ یہ ٹیلیفون صرف تین گنتیوں پر انگلی مارنے سے عمل کرتا ہے — ۹۱۱ کوئی شخص ہنگامی حالت میں مدد کے لئے ان تین نمبروں پر انگلی مارتا ہے اور فی الفور اس کو اس کی مطلوبہ مدد مل جاتی ہے۔ امریکہ کی ایک ٹیلیفون کمپنی نے ایسا سسٹم وضع کیا ہے کہ آدمی ۹۱۱ پر انگلی چلاتا ہے اور دوسری طرف کا خودکار نظام بغیر بتائے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ کال کس نمبر کے ٹیلیفون سے آرہی ہے۔ مزید یہ کہ خودکار نظام عین اسی وقت نمبر کو پتہ میں تبدیل کر لیتا ہے بغیر اس کے کہ ڈائل کرنے والا ایک لفظ بھی بولا ہو۔ حتی کہ یہ خودکار نظام یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ پکارنے والے کو کس قسم کے مدد کی ضرورت ہے — پولیس کی یا آگ بجھانے کی یا ایمبولنس کی۔

فلوریڈا کا واقعہ ہے کہ ایک گھبرائی ہوئی عورت نے ۹۱۱ کو ڈائل کیا مگر وہ کچھ بول نہ سکی۔ تاہم خودکار سسٹم نے بندوق کی آواز سن کر معاملہ کی نوعیت سمجھ لی۔ صرف چند منٹ کے اندر پولیس کی گاڑی حادثہ کے ٹھیک پتہ پر روانہ ہو چکی تھی۔ عورت کا ایک رشتہ دار کسی بات پر بگڑ کر گھر میں گھس آیا تھا اور گولی چلا رہا تھا۔ مجرم فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ اسی طرح امریکہ میں ایک گونگے اور بہرے آدمی کو ہنگامی طور پر مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے ۹۱۱ ڈائل کیا اور مزید کچھ بتائے بغیر مدد اس کے دروازہ پر موجود تھی۔

ان مثالوں میں کمپوٹر نے مجرد کال کو اس کے ٹیلیفون نمبر میں تبدیل کیا۔ پھر ٹیلیفون نمبر کو گھر کے پتہ میں بدلا۔ اس کے بعد اس نے بلا تاخیر وائرلس پر پولس کو اطلاع کر دی۔

قرآن اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بندہ جب خدا کو پکارتا ہے تو فوری طور پر بندہ اور خدا کے درمیان ربط قائم ہو جاتا ہے۔ خدا کو پکارنے اور اس سے مربوط ہونے میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

ٹیلی فونی ربط کا مذکورہ واقعہ اسی روحانی حقیقت کی مادی تمثیل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنے رب کی یاد سے بے قرار ہو کر اس کو بیتابانہ پکارتا ہے تو اچانک وہ اپنے آپ کو اس سے انتہائی قریب پاتا ہے۔ وہ ایک لمحہ میں اس سے مربوط ہو جاتا ہے۔

زندگی کا مسئلہ

برازیل جنوبی امریکہ کا ایک ملک ہے جو اٹلانٹک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۱۹ ملین ہے جس میں زیادہ تر رومن کیتھولک ہیں۔ برازیل میں ۱۹۶۴ سے فوجی حکومت قائم تھی۔ فوجی حکومت کے خلاف جن جمہوریت پسند لیڈروں نے تحریک چلائی ان میں ایک ممتاز نام ٹینکریڈ نویس (Tancred Neves) کا تھا۔ مسٹر نویس نے بے شمار مصیبتیں اٹھائیں۔ ۲۱ سال کی پرمشقت جدوجہد کے بعد بالآخر وہ ملک کے عوام کو حکومت کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ فوجی حکمراں مجبور ہوگئے کہ ملک میں عام انتخابات کرائیں۔

جنوری ۱۹۸۵ میں الکشن ہوا۔ اس الکشن میں مسٹر نویس بھاری اکثریت سے صدر منتخب ہوگئے۔ اخبارات اور ریڈیو نے ان کی کامیابی کا شاندار تذکرہ کیا۔ ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ـــــ ان کی جیت ایک شخص کے تقریباً پچاس سالہ سیاسی کردار کی تکمیل ہے:

His victory capped a political career spanning nearly 50 years

۱۵ مارچ ۱۹۸۵ کو مسٹر نویس کی حلف برداری کی رسم صدارتی محل میں ادا کی جانے والی تھی کہ عین اسی روز چند گھنٹہ پہلے وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ انھیں فوری اسپتال لے جایا گیا۔ ملک کے سب سے بہتر اسپتال میں وہ ایک مہینہ تک ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہے۔ اس مدت میں ان کا سات آپریشن کیا گیا۔ مگر ساری کوشش ناکام ہوگئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ کو مسٹر نویس کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کا پھل نہیں پاتا۔ اس کے لئے فتح کا تاج تیار کیا جاتا ہے مگر اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس کو اپنے سر کی زینت بنائے۔ اس کی کوششوں کی تکمیل اس کی بربادیوں کی تکمیل بن جاتی ہے۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا صرف عمل کرنے کی جگہ ہے، وہ پانے کی جگہ نہیں۔ پانے کی جگہ کوئی اور ہے جو اس کے ماوراء ہے۔

جھوٹی عظمت

نپولین بونا پارٹ (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) ایک فوجی افسر تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر وہ فرانس کی حکومت پر قابض ہو گیا۔ ۱۸۰۴ میں اس نے فرانس کے حین حیاتی شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ نپولین نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کو چھوڑ کر وہ پورے یورپ کا فاتح بن گیا۔ اس نے فرانس کی ایک دلکش خاتون جوزفین (Josephine) سے شادی کی۔ مگر ۱۸۱۰ میں اس نے جوزفین سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ کیونکہ وہ شہنشاہ یورپ کا جانشین پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اس کے بعد نپولین نے آسٹریلیا کے بادشاہ کی لڑکی میری لوئی (Marie-Louise) سے شادی کی۔ ۱۸۱۱ میں اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فرانسس جوزف چارلس رکھا۔ نپولین خوش تھا کہ اس نے اپنی بادشاہت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے اپنا ایک ولی عہد پا لیا ہے۔ مگر اس کے جلد ہی بعد یہ واقعہ ہوا کہ نپولین کی سیاسی حرص نے اس کو روس سے ٹکرا دیا۔ روس کی فوجیں اگرچہ نپولین کی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ تاہم روس کا جغرافیہ اس کی مدد پر آ گیا۔ نپولین کی فوجیں روس کی شدید برفباری کی تاب نہ لا سکیں۔ نپولین اس حال میں روس سے واپس آیا کہ اس کی فوج کا بڑا حصہ راستہ میں برباد ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ میں ہوا۔ بعد کے حالات اس کے لئے اور بھی ناموافق ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۵ میں نپولین کو برطانی فوجوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کو گرفتار کر کے جزیرہ سینٹ ہیلینا بھیج دیا گیا۔ یہاں ۱۸۲۱ء میں وہ قید کی حالت میں مر گیا۔

انسان اپنی اولاد تک کے لئے عظمت کا خواب دیکھتا ہے حالانکہ وہ خود بہت جلد بے عظمت ہو جانے والا ہے۔ اس دنیا میں ہر روز کوئی "نپولین" بے عظمت ہو کر مر رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ کوئی نہیں جو اس کو اپنی زندگی کے لئے رہنما بنائے۔

موجودہ دنیا میں ہر انسان کو صرف محدود موقع دیا گیا ہے۔ مگر ہر انسان اپنے لئے لامحدود منصوبہ بناتا ہے۔ ہر شخص کی عظمت آخر کار یہاں خاک میں مل جاتی ہے۔ ہر دیکھنے والا اس کو دیکھتا ہے مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی اسی کہانی کو دوبارہ لکھنا چاہتا ہے جس کو اس کے پیش رو نے لکھنا چاہا تھا مگر وہ اس کو لکھنے میں ناکام رہا۔

دین داری

دینداری اصل میں اپنی ذات کی سطح پر دیندار بننے کا نام ہے۔ اپنی انا کو کچلنا اور اپنے اندرون میں خدا کو بسانا وہ چیز ہے جو اسلام کا اصل مطلوب ہے۔ جب آدمی اپنے آپ میں جینے کے بجائے خدا میں جینے لگے۔ جب دنیا کے بجائے آخرت اس کا مقصود بن جائے جب پانے سے زیادہ کھونا اس کو محبوب نظر آتا ہو تو اس نے دین کو پایا، اس نے اپنے خدا کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا۔

آدمی اکثر حالات میں باہر باہر جیتا ہے اس لئے وہ ایسے دین کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے جو اس کو اپنے سے باہر کی زندگی میں کوئی مشغلہ دیتا ہو۔

جو دین لاؤڈ اسپیکر کی سطح پر چیخ پکار کا پروگرام دے، جس دین میں آدمی کو جلسے اور جلوس کی سطح پر کارنامے دکھانے کا موقع ملتا ہو۔ جس دین میں سیر و سیاحت کی چاشنی موجود ہو۔ جس دین میں حکمرانوں سے نوک جھونک کرنے کا جواز ہاتھ آتا ہو۔ جو دین بحث و مناظرہ کی دلچسپیاں فراہم کرتا ہو۔ جس دین میں شامیانہ سجانے اور کھانے پینے کی دھوم مچانے کے مواقع ملتے ہوں۔ جس دین میں دوسروں کو گولی کا نشانہ بنا کر اس کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھنے کا منظر نصیب ہوتا ہو۔ جس دین میں دوسروں کے پیسہ پر مفت کی لیڈری قائم کرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہوں ـــــ دین کی یہ تمام صورتیں دین کو اپنے سے باہر پانے کی صورتیں ہیں۔ اس لئے وہ لوگ بہت جلد ایسے دین کی طرف دوڑ پڑتے جو اپنے آپ کو بچائے ہوتے ہوں اور اپنے سے باہر دین کا ثبوت دے کر دیندار بننا چاہتے ہوں۔

دین اپنے اندر سفر کرنے کا نام ہے۔ دین اپنے آپ کو انانیت کے تخت سے اتارنا ہے۔ دین خود اپنے اندر جھانکنے کا نام ہے نہ کہ دوسروں کا ماہر بننے کا۔ درخت اپنے آپ میں جیتا ہے، اسی طرح مومن اپنے آپ میں جیتا ہے۔ درخت اسی وقت درخت بنتا ہے جب کہ اس کی جڑیں زرخیز زمین میں قائم ہو جائیں۔ اسی طرح مومن ایک روحانی درخت ہے جو خدا کی زمین میں اگتا ہے۔ وہ زمین و آسمان سے ایمانی رزق لے کر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کی دنیا تک پہنچ جاتا ہے جس کا نام جنت ہے۔

خدا پرستی

موجودہ دنیا میں زندگی گزارنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خود رخی (Self oriented) زندگی۔ دوسری خدا رخی (God oriented) زندگی۔

آدمی یا تو خود پرست ہوگا یا خدا پرست۔ اس کا مرکز و محور اپنی ذات ہوگی یا خدا کی ذات۔ وہ یا تو اپنے رخ پر دوڑے گا یا خدا کے رخ پر۔ زندگی کے بس یہی دو طریقے ہیں۔ ان کے سوا زندگی کا کوئی تیسرا طریقہ نہیں۔

خود رخی زندگی وہ ہے جس میں آدمی کی توجہ کا مرکز صرف اس کی اپنی ذات ہو۔ وہ بس اپنے آپ میں جیے۔ وہ اپنے وسائل کو اپنی ذات کی تکمیل میں خرچ کرے۔ فلسفیانہ زبان میں اس طرزِ فکر کا نام ذاتی طرزِ فکر (Self-centered thinking) ہے۔ اور اخلاقی زبان میں اس کو خود غرضی، بے اصولی، خواہش پرستی اور مفاد پسندی کہا جاتا ہے۔ ایسا آدمی دیکھنے میں بظاہر انسان ہوتا ہے، مگر اندر سے وہ حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے جینے کی سطح اور حیوانات کے جینے کی سطح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

خدا رخی زندگی وہ ہے جس میں آدمی کی توجہات کا مرکز صرف ایک خدا ہو۔ خدا کو وہ ایک ایسے بڑے کی حیثیت سے پالے جس کے بعد اپنی ذات سمیت سب کچھ اس کی نظر میں چھوٹا ہو جائے۔ اس کو یاد آئے تو خدا کی یاد آئے۔ اس کو امید ہو تو خدا سے امید ہو۔ اس کو ڈر ہو تو صرف خدا کا ڈر ہو۔ خدا کی ذات اس کی نظر میں سب کچھ ہو اور اپنی ذات اس کی نظر میں بے کچھ۔

یہی دوسرا انسان خدا پرست انسان ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند انسان ہے کیوں کہ اس نے وہ روش اختیار کی ہے جو کائنات کے مجموعی نظام سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ اس نے اس صحیح راستہ کو پالیا ہے جس پر چلنے والا اس حقیقی منزل تک پہنچ جاتا ہے جس کے سوا خدا کی اس کائنات میں دوسری کوئی منزل نہیں۔

انسان کی منزل خدا ہے۔ اس سے کمتر کوئی چیز انسان کی منزل نہیں ہوسکتی۔

جھوٹی دھوم

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مئی ۱۹۸۵) میں ہندستانی شادیوں کے بارہ میں ایک سبق آموز رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ہیلی کاپٹر بارات (Copter Barat)

اس میں بتایا گیا ہے کہ سوائی مادھوپور کی مینا برادری میں خوش حالی کی علامت اب یہ بن گئی ہے کہ بارات دلہن کے گھر آئے تو ہیلی کاپٹر کے ذریعہ آئے، خواہ دولھا کے گھر سے دلھن کے گھر تک کا فاصلہ ۰ اکلومیٹر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے پہلے شادیوں میں جہیز اور تلک کی دھوم تھی۔ اب اس سے آگے بڑھ کر بمبئی کی ایک فرم سے ہیلی کاپٹر کرایہ پر حاصل کئے جا رہے ہیں۔

شادیوں میں ہیلی کاپٹر کا استعمال کیوں کیا جا رہا ہے، اس کا جواب اخباری رپورٹر نے ان الفاظ میں دیا ہے:

The parents of the bride expect the 'barat' to reach their village with adequate pomp and show.

دلھن کے والدین امید کرتے ہیں کہ بارات ان کے گاؤں میں دھوم دھام کے ساتھ آئے۔

انسان سمجھتا ہے کہ اس کی سواری کسی دولھا یا کسی دولھن کے گھر اترنے والی ہے۔ اس لئے وہ شان و شوکت کے ساتھ اپنی سواری لے جانے کا اہتمام کر رہا ہے۔ اگر انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس کی سواری بالآخر جہاں پہنچنے والی ہے وہ مالک کائنات کی عدالت ہے تو انسان کی سوچ یکسر بدل جائے۔ اس کو معلوم ہو کہ شان والی شادی اور بے شان والی شادی میں کوئی فرق نہیں۔

کوئی شخص اپنی قتل گاہ کی طرف دھوم مچاتا ہوا نہیں جاتا۔ کوئی شخص ایک ایسی عدالت میں جشن کے ساتھ داخل نہیں ہوتا جہاں ایک بااختیار جج اس کے خلاف فیصلہ سنانے کے لئے بیٹھا ہوا ہو مگر اپنی آخری منزل کے بارہ میں ہر آدمی اسی نادانی میں مبتلا ہے۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کی سواری خدا کے یہاں باعزت طور پر اتاری جائے۔ اور ناکام انسان وہ ہے جو خدا کے یہاں اس حال میں پہنچے کہ وہاں اس کی حیثیت ایک غیر مطلوب انسان کی ہو۔ وہاں نہ کوئی اس کا استقبال کرنے والا ہو اور نہ کوئی اس کی خبر گیری کرنے والا۔

اہلیت

ایک شخص اچھے خاندان میں پیدا ہوا۔ بعد کو اس کے حالات خراب ہو گئے۔ معاشی اعتبار سے وہ بالکل مفلس ہو کر رہ گیا۔ اس زمانہ میں اس کے تمام دوست اور رشتہ دار اس سے جدا ہو گئے۔ کوئی اس کا بھی روادار نہ تھا کہ اس سے ملاقات اور سلام کلام کا تعلق رکھے۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس کے حالات بدل گئے۔ وہ اپنی بستی کا سب سے زیادہ خوش حال آدمی بن گیا۔ اب اس کے پرانے دوست اور رشتہ دار اس کے پاس آنے لگے۔ وہ اس کو یقین دلاتے کہ ہم تو ہمیشہ تمہارے خیر خواہ تھے۔ مگر آدمی پر ان لوگوں کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ان میں سے کسی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ ایک شخص جو ہر حال میں اس کا ساتھی بنا رہا۔ اس کو اس نے بہت بڑے پیمانہ پر نوازا۔ اس کو اس نے اپنا سب سے قریبی ساتھی اور مشیر کار بنالیا۔

یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قدر وہ ہے جو ناموافق حالات میں قابل قدر ہونے کا ثبوت دے۔ جو دعوت حق کو اس وقت پہچانے جب کہ دعوت حق ماحول میں اجنبی بنی ہوئی ہو۔ جو دین خداوندی کے ساتھ ایسے حالات میں اپنے کو وابستہ کرے جب کہ دین ظاہر بینوں کو بے قیمت نظر آتا ہو۔

اللہ تعالیٰ دلوں کو دیکھتا ہے نہ کہ جسموں کو۔ اللہ کے یہاں حقیقت کی قدر ہے نہ کہ ظاہری دکھاوے کی۔ اللہ کو وہ بندے پسند ہیں جو اس وقت جھک گئے ہوں جب کہ اس کی قوتیں ابھی غیب میں چھپی ہوئی ہیں۔ اللہ کو وہ بندے درکار ہیں جن کی بصیرت کی نگاہیں کھلی ہوئی ہوں۔ اللہ کو وہ بندے درکار نہیں جن کے اندھے پن کا یہ حال ہو کہ وہ پیشانی کی آنکھ سے دکھائی دینے والی چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو دیکھ ہی نہ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ دینے والے دور میں دئے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ پہچاننے والا وہ قرار پاتا ہے جس نے نہ پہچانے والے حالات میں پہچاننے کا ثبوت دیا ہو۔ انعام کا مستحق وہ ہے جس نے اس وقت ساتھ دیا ہو جب کہ لوگوں نے اس کو غیر اہم سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

جب پردہ کھلے گا

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ان سب کے ساتھ ایک ہی مشترک حادثہ پیش آیا۔ وقت کے اکابر نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ جو لوگ ماحول کے اندر بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے انھوں نے ان کو قابل التفات نہیں سمجھا۔

وقت کے یہ اکابر سب کے سب وہ لوگ تھے جو خدا کو مانتے تھے۔ وہ اس کو بھی مانتے تھے کہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام دینے والا آتا ہے۔ حتی کہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو آنے والے پیغمبر خدا کا پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس کی یاد میں پرجوش تقریریں کرتے تھے۔ مگر جب وہ آنے والا آیا تو انھوں نے اس کو نہیں پہچانا۔ انھوں نے حقارت کے ساتھ اس کو رد کر دیا۔

چونکہ وہ تقلید آبار کی سطح پر جی رہے تھے وہ صرف ان پچھلے پیغمبروں کو پہچان سکے جن کا نام ان کے آبائی مذہب میں شامل تھا۔ جو ان کی قومی تقلید کا حصہ بن چکا تھا۔ جو انھیں تاریخی روایات کے تسلسل میں مل رہا تھا۔ وقت کا پیغمبر ابھی ان اضافی خصوصیات سے خالی تھا اس لئے وہ ان کو دکھائی بھی نہیں دیا۔ وقت کے نمائندۂ خدا کو پہچاننے کے لئے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار تھی اور یہ لوگ اس سے محروم تھے، پھر وہ وقت کے پیغمبر کو کس طرح پہچانتے۔

یہ سب کرتے ہوئے وہ مذہب کا جھنڈا بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے پیغمبروں کا مومن ہونے پر فخر کرتے تھے۔ عوام کے درمیان وہ خدا کے دین کے سب سے بڑے حامی بنے ہوتے تھے۔ مگر خدا کے یہاں وہ بالکل بے قیمت قرار پائے۔ کیوں کہ ان کا مذہب آبار کی تقلید کی سطح پر پیدا ہوا تھا نہ کہ حقیقت کے اعتراف کی سطح پر۔

آخرت میں جب ان پر کھلے گا کہ انھوں نے جس کو نظر انداز کیا وہی وہ تھا جس کی زبان سے خدا نے اپنا کلام جاری کیا تھا۔ جو دنیا میں خدا کا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا گیا تھا تو یہی واقعہ ان کی ابدی روسیاہی کے لئے کافی ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ ہائے ہمارا اندھا پن، ہم نے اسی کو نہ دیکھا جس کو ہمیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہئے تھا۔ ہم نے اسی کو نہ پہچانا جس کو ہمیں سب سے زیادہ پہچاننا چاہئے تھا۔

مشینی تعبیر

جولائی ۱۹۸۲ میں امریکی بحریہ نے فوجی مشقیں کی تھیں۔ یہ فوجی مشقیں سان فرانسسکو کے ساحل پر ہوئیں۔ یہ پورا عمل کمپوٹروں کے ذریعہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں بحریہ کے توپ خانہ کو فائر کرنا تھا فائرنگ کے دوران کمپوٹر میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپوٹر عقبی جانب گولے برسانے لگا۔ یعنی جس طرف فائرنگ مطلوب تھی اس کے بالکل الٹی طرف۔

ابتدائی پروگرام کے مطابق اس مشقی گولہ باری میں امریکی بحریہ کے توپ خانہ کے گولے دور سمندر میں جاکر گرتے مگر توپوں کا رخ الٹا ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گولے میکسکو کے ایک مال بردار جہاز کے پاس جاکر گرنے لگے۔

کمپوٹر میں اس طرح کے لطیفے بار بار پیش آتے ہیں جن کی اطلاع اخبارات ورسائل میں آتی رہتی ہے۔ کمپوٹر کے عمل میں ایسی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کمپوٹر صرف ایک مادی مشین ہے۔ اس کے پاس عقل نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کائنات اگر ایک مادی مشین ہوتی جیسا کہ جدید ملحدین کا دعویٰ ہے، تو وہ کبھی اس طرح انتہائی درست طور پر نہ چل سکتی جیسا کہ وہ چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین اور اس کی آبادیاں اسی طرح برباد ہو چکی ہوتیں جس طرح زلزلہ کے بعد زلزلہ کا مقام برباد ہوجاتا ہے۔ کائناتی حادثات کے نتیجہ میں کائنات بھی تباہ ہوچکی ہوتی اور وہ انسان بھی جو کائنات کی مادی تعبیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''کائنات کا کوئی خدا نہیں، وہ صرف ایک مادی مشین ہے'' یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے بظاہر درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ درست نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر داخلی تضاد پایا جاتا ہے۔

یہ جملہ اس وقت صحیح ہوتا جب کہ ایسی کوئی مادی مشین ہوتی جو کسی بنانے والے کے بغیر بن جائے اور کسی چلانے والے کے بغیر چلنے لگے۔ ہم جن مشینوں سے واقف ہیں ان کو ''انسان'' بناتا اور چلاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ یہ مشینیں نقص سے خالی نہیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ کائنات جیسا بے عیب کارخانہ اپنے آپ وجود میں آجائے اور اپنے آپ نہایت درست طور پر مسلسل چلتا رہے۔

امتحان گاہ

قرآن وحدیث میں زندگی کا یہ تصور دیا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ملتا ہے۔ وہ اس کا حق نہیں ہوتا۔ آدمی ان چیزوں سے صرف ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھاتا ہے اس کے بعد موت آتی ہے اور اس کے ساز وسامان سے اسے جدا کر دیتی ہے۔ موت سے پہلے یہ چیزیں ہر ایک کو ملتی ہیں مگر موت کے بعد صرف اس کو ملیں گی جو آزمائش میں پورا اترے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک طالب علم امتحان کے کمرہ میں ہے۔ وہ اپنا تعلیمی امتحان دے رہا ہے۔ اس وقت بظاہر وہ ایک مکان میں ہے۔ اس کے پاس میز اور کرسی اور دوسرے ضروری سامان ہیں۔ اس کے خدمت گار بھی وہاں موجود ہیں۔

بظاہر دیکھنے والوں کو وہ صاحب ملک آدمی نظر آتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ محض وقتی ہے۔ جیسے ہی وقت پورا ہونے کا الارم بجتا ہے۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا کچھ بھی نہ تھا۔ ہر چیز جو وہاں اس کے پاس تھی اس سے واپس لے لی جاتی ہے اور وہ بلا تاخیر امتحان گھر کے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا بھی ہے۔ یہ دنیا انسان کے لئے ایک خدائی امتحان گاہ ہے یہاں ہر آدمی صرف اس لئے ہے کہ وہ اپنا امتحان دے۔ خدا نے ہر آدمی کے لئے امتحان کی مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جیسے ہی یہ مدت پوری ہوتی ہے۔ فوراً موت کا فرشتہ آتا ہے اور آدمی کو بجبر اس دنیا سے نکال کر خدا کے سامنے حاضر کر دیتا ہے تاکہ ہر آدمی کو اس کے عمل کے مطابق اس کا بدلہ دیا جائے۔

موت کا لمحہ امتحان کی مدت ختم ہونے کا لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی جان لیتا ہے کہ ان چیزوں میں سے اس کا کچھ نہ تھا جن کو وہ اپنا سمجھے ہوئے تھا۔ جس مکان کو اس نے بنایا تھا وہ اس سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ جس جائداد کو وہ اپنی چیز سمجھتا تھا وہ اس سے چھین لی جاتی ہے۔ جن آدمیوں کو وہ اپنے آدمی سمجھتا تھا وہ اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔

یہ لمحہ ہر آدمی پر آنے والا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ جو اس کے آنے سے پہلے اس کو جان لے جو آنے سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔

اعتراف

چارلس ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۹) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان دوسرے حیوانات ہی کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ یہ ایک بے حد عجیب نظریہ تھا۔ کیونکہ انسان انتہائی غیر معمولی حد تک دوسرے جانوروں سے مختلف ہے۔ پھر کیسے یہ ممکن ہوا کہ ایسا کا دماغ ترقی کرتے کرتے انسان کا دماغ بن جائے۔ یہ نظریہ اتنا بعید از قیاس تھا کہ ڈارون خود اپنے اس نظریہ کے بارہ میں حیرانی میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے اپنی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) کے آخر میں لکھا ہے:

> Can the mind of man, which has, as I fully believe, been developed from a mind as low as that possessed by the lowest animals, be trusted when it draws such grand conclusions? I cannot pretend to throw the least light on such abstruse problems.

انسان کا دماغ جس کے متعلق میرا کامل عقیدہ ہے کہ وہ اس معمولی دماغ سے ترقی کرکے بنا ہے جو انتہائی ادنی حیوانات کو حاصل ہوتا ہے۔ کیا ایسے دماغ پر اس وقت بھروسہ کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ اتنے بڑے بڑے نتائج اخذ کر رہا ہو۔ میں یہ دکھانے کی جھوٹی کوشش نہیں کروں گا کہ میں اس قسم کے مشکل مسائل پر کچھ بھی روشنی ڈال سکتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور کائنات کی تشریح کا مسئلہ ناقابل قیاس حد تک بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی انسان اپنی محدود عمر اور محدود صلاحیت کے ساتھ اس کی تشریح کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی اس کی تشریح کرنے بیٹھتا ہے وہ ہمیشہ احساس عجز کا شکار رہتا ہے۔ خواہ اپنی زبان سے وہ اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔

یہ واقعہ اس کا ثبوت ہے کہ زندگی اور کائنات کی حقیقت بتانے کے لئے انسانی دماغ سے برتر ایک دماغ درکار ہے۔ یہ کام صرف خدا کر سکتا ہے اور خدا نے پیغمبروں کے واسطے سے اس کو انجام دیا ہے۔ یہ ایک قرینہ ہے جو پیغمبرانہ ہدایت کی ضرورت اور واقعیت کو ثابت کرتا ہے۔

یہ ماہرین

پروفیسر راج کرشنا (۱۹۸۵-۱۹۲۵) ہندستان کے پچاس انتہائی اعلیٰ اذہان میں شمار ہوتے تھے۔

علم اقتصادیات میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے وہ بین اقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ ملک کے بڑے بڑے معاشی عہدوں پر فائز رہے۔ آخر عمر میں وہ ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن) کے ایک پروجیکٹ کے تحت تین مہینہ کے لئے روم (اٹلی) گئے تھے۔ ابھی وہ اپنے کام کی تکمیل نہیں کر سکے تھے کہ ۲۱ مئی ۱۹۸۵ کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف ۵۹ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ مئی ۱۹۸۵)

پروفیسر راج کرشنا زرعی اقتصادیات کے ایک مانے ہوئے اکسپرٹ تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ کا اختصاصی مطالعہ کیا تھا کہ تیسری دنیا کے غربت کے ماحول میں روزگار کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے:

He was an acknowledged expert in agricultural economics and had specialised in the study of employment conditions of poverty in the third world.

کیسے عجیب ہوں گے مسائل عالم کے وہ ماہرین جن کو خود اپنے مسئلہ کی خبر نہ ہو۔ انسان کا حال بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ اپنے کل کو نہیں جانتا اور دوسروں کے مستقبل پر ریسرچ کرتا ہے۔

وہ خود فکری افلاس میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کے معاشی افلاس پر تقریر کے کارنامے دکھاتا ہے۔ مسائل عالم کی مہارت پر اس کو بڑے بڑے خطابات دئے جاتے ہیں۔ مگر جب تجربہ ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے قریبی مسئلہ سے بھی ناآشنا تھا۔ کیسا عجیب ہے لوگوں کا جاننا اور کیسا عجیب ہے ان کا نہ جاننا۔

امت کا زوال

سورۃ المائدہ (۱۳-۱۴) میں یہود اور نصاریٰ کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اس نصیحت کا بڑا حصہ کھو دیا جو انھیں ان کے نبیوں کے ذریعہ کی گئی تھی (فنسوا حظا مما ذکروا بہ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سواء السبیل سے بھٹک گئے۔ ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہو گئی۔ وہ باہمی اختلاف اور ٹکراؤ میں مبتلا ہو گئے۔

فنسوا حظا مما ذکروا بہ کی تشریح حضرت حسن بصری نے ان الفاظ میں کی ہے:

ترکوا عری دینھم و وظائف اللہ تعالی التی لا یقبل العمل الا بھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

انھوں نے دین کے عُریٰ کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے ان وظائف کو ترک کر دیا جن کے بغیر اعمال کبھی قبول نہیں کئے جاتے۔

عروہ (جمع عُریٰ) کے لفظی معنی کاج کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جس میں کوئی چیز اٹکائی جائے۔ استعمالی معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب ہے نفیس مال، کسی چیز کا بہتر حصہ۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود و نصاریٰ کو جو دین دیا گیا تھا اس کا اصل حصہ انھوں نے بھلا دیا۔ اب جو چیز وہ دین کے نام پر لئے ہوتے ہیں وہ گویا ایک ایسا جسم ہے جس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

دین کا ایک ظاہری حصہ ہے اور ایک اس کا معنوی حصہ۔ دین کا معنوی حصہ دوسرے لفظوں میں اس کا خدائی حصہ ہے۔ یعنی خدا سے سب سے زیادہ ڈرنا، اس سے سب سے زیادہ محبت کرنا۔ اس کے آگے قلب و دماغ کا پوری طرح جھک جانا، یہ دین کا عُریٰ ہے۔ دین کے ظاہری حصہ سے مراد وہ خارجی اعمال ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف انداز سے کئے جاتے ہیں۔

کسی امت کا سواء السبیل پر ہونا یہ ہے کہ دین اس کے اندر معنوی (بالفاظ دیگر، خدائی پہلو) کے اعتبار سے زندہ ہو۔ مگر جب امت میں بگاڑ آتا ہے تو اگرچہ اس کے درمیان اب بھی دین کے نام پر بہت سی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں مگر اس کی زندگی سے خدا حذف ہو جاتا ہے۔ دین کا معنوی پہلو گم ہو جاتا ہے اور دین کا ظاہری پہلو مزید اضافہ کے ساتھ اس کے درمیان ابھر آتا ہے۔

دورِ زوال میں دین اپنی شکل کے اعتبار سے ختم نہیں ہوتا۔ البتہ وہ اپنی روح کے اعتبار سے ختم ہو جاتا ہے۔ خدا کی بڑائی کے چرچے کرنا لوگ نہیں جانتے البتہ خدا کے نام پر دوسری چیزوں کے چرچے سے وہ خوب واقف ہوتے ہیں۔

فضائل اعمال اور مسائل اعمال کا زور، تاریخ اسلام اور حکومت اسلام کے چرچے، اکابرامت اور بزرگان دین کے تذکرے، جشن میلاد اور ایصال ثواب کے ہنگامے، سب اسی کی مثالیں ہیں۔ جب دین کا خدائی پہلو حذف ہو جاتا ہے تو ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس کا کوئی ظاہری پہلو لے لیتا ہے اور اسی کے اوپر اپنے زبان و قلم کی ساری قوت صرف کرنے لگتا ہے۔

جب کسی امت کا یہ حال ہو جائے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ سواء السبیل سے ہٹ گئی۔ اس نے دین کا بڑا حصہ کھو دیا۔ وہ خدا کی رحمت سے بہت دور چلی گئی۔

حضرت حسن بصری تابعی نے تقریباً ستر صحابہ کو دیکھا تھا۔ انھوں نے ایک بار اپنے زمانہ کے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ جتنا زیادہ نفل نمازیں پڑھتے ہو اور جتنا زیادہ نفل روزے رکھتے ہو، اصحاب رسول اتنا زیادہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ تم لوگوں سے افضل تھے۔ پوچھا گیا کہ کیوں وہ افضل تھے۔ حضرت حسن بصری نے جواب دیا:

ان کے سینوں میں اللہ کا خوف پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا تھا۔

لوگ انسانی عظمتوں میں گم ہیں، صحابہ کرام خدائے ذوالجلال کی عظمتوں میں گم تھے۔ لوگ عوام کی مرضی پر نظر رکھتے ہیں، صحابہ کرام خدا کی مرضی کو دیکھتے تھے۔ لوگوں کو قیادت کے اسٹیج پر نمایاں ہو کر تسکین ملتی ہے۔ صحابہ کرام تواضع کے خلوت کدوں میں تسکین پاتے تھے۔

لوگ بولنا جانتے ہیں، صحابہ کرام چپ رہنا جانتے تھے۔ لوگ ہنگاموں میں جیتے ہیں، صحابہ کرام تنہائیوں میں جیتے تھے۔ لوگوں نے دنیا کے مسئلہ کو مسئلہ سمجھ رکھا ہے، صحابہ کرام نے آخرت کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنایا تھا۔ لوگ وقتی کامیابیوں کی طرف دوڑتے ہیں، صحابہ کرام وہ لوگ تھے جو ابدی کامیابی کے شوق میں وقتی کامیابی کو اس طرح بھلا چکے تھے جیسے اس کا وجود ہی نہیں۔

سازش کا راز

سعودی حکمراں شاہ فیصل ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ کو قتل کر دئے گئے۔ قاتل ان کا بھتیجا شہزادہ فیصل بن مساعد تھا۔ مسٹر ایلن ہارٹ نے اپنی انگریزی تصنیف "یاسر عرفات؛ دہشت پسند یا امن کے نقیب" میں لکھا ہے کہ قتل کا منصوبہ اسرائیلی ایجنٹوں نے تیار کیا تھا۔ فیصل بن مساعد کی حیثیت محض آلۂ کار کی تھی۔ مصنف نے تنظیم آزادی فلسطین کی امور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین مسٹر خالد حسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ فیصل بن مساعد کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے والد کی موت کے ذمہ دار شاہ فیصل ہیں۔ نیز یہ کہ شاہی خاندان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہا ہے۔ اس کے سینے میں انتقام اور محرومی کا احساس دبا ہوا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹوں نے اس کے اسی احساس کو استعمال کیا۔

فیصل بن مساعد تعلیم کے لئے امریکہ میں مقیم تھا۔ اس زمانہ میں باقاعدہ منصوبہ کے تحت ایک یہودی لڑکی نے اس سے دوستی کی اور اس کو نشہ آور چیزوں کا عادی بنا دیا۔ یہ لڑکی جو اسرائیلی خفیہ ایجنسی کی ایک رکن تھی، فیصل بن مساعد کے اوپر بری طرح چھاگئی۔ جب یہودی عورت نے محسوس کیا کہ وہ اپنی آنکھ سے دیکھنے اور اپنے ذہن سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے تو اس نے شہزادہ کا ہمدرد بن کر اس کے اندر یہ جذبہ ابھارا کہ وہ شاہ فیصل کے ظلم اور ناانصافی کا بدلہ لینے کے لئے انھیں قتل کر دے۔

مسٹر خالد حسن کے خیال کے مطابق یہود نے شاہ فیصل کو اس لئے قتل کرایا کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ وہ عرب اتحاد پیدا کر کے ان کے لئے خطرہ بن جائیں گے اور امریکہ کو مجبور کریں گے کہ وہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ کی سرحدوں پر دوبارہ واپس لے جائے۔

یہ ایک مثال ہے جس اندازہ ہوتا ہے کہ ان واقعات کی حقیقت کیا ہے جن کو ہم "دشمنان اسلام کی سازش" کا نام دیا کرتے ہیں۔ یہ سازشیں خود مسلمانوں کے اپنے کمزور پہلوؤں کا استعمال ہیں نہ کہ محض یک طرفہ سازش۔

اسلام کے دشمن اسلام کے خلاف اپنی سازشوں میں صرف اس وقت کامیاب ہوتے ہیں جب کہ وہ مسلمانوں کے اندر اپنے لئے کوئی موافق عنصر کو پالیں۔ اس اپنے اندر کے عنصر کو درست کر دیجئے اور پھر کسی دشمن کی کوئی سازش آپ کے خلاف کامیاب نہیں ہوگی۔

کمی کی تلافی

قیصر ولیم دوم (Friedrich William II) ۱۸۸۸ سے لے کر ۱۹۱۸ تک جرمنی کا بادشاہ تھا۔ اس کا بایاں بازو پیدائشی طور پر ناقص اور چھوٹا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے غیر معتدل مزاج کا سبب اس کا یہی عضویاتی نقص تھا۔

قیصر ولیم ہی کی غیر مدبرانہ سیاست کے نتیجہ میں پہلی جنگ (۱۹۱۸-۱۹۱۴) چھڑی۔ اس میں ایک طرف جرمنی اور اس کے ساتھی تھے اور دوسری طرف برطانیہ اور اس کے ساتھی۔ آخر کار جرمنی کو شکست ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی قیصر ولیم کی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ قید یا قتل سے بچنے کے لئے اس نے اپنا ملک چھوڑ دیا۔ وہ ندر لینڈ چلا گیا۔ وہاں وہ دوم (Doom) میں خاموشی سے زندگی کے بقیہ دن گزارتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ جون ۱۹۴۱ کو ۸۲ سال کی عمر میں مر گیا۔

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ قیصر ولیم دوم ایک سرکاری دورہ پر سوئٹزرلینڈ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ سوئٹزرلینڈ اگرچہ ایک چھوٹا ملک ہے مگر اس کی فوج بہت منظم ہے۔ اس نے ملاقات کے دوران سوئٹزرلینڈ کے ایک فوجی سے مزاحیہ انداز میں کہا کہ جرمنی کی زبردست فوج جس کی تعداد تمہاری فوج سے دگنی ہو، اگر تمہارے ملک پر حملہ کر دے تو تم کیا کرو گے۔ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا :

سر، ہمیں بس ایک کے بجائے دو فائر کرنے پڑیں گے۔

سوئس فوجی کا یہ چھوٹا سا جملہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اعلان ہے ———— وسائل اگر کم ہوں تو کارکردگی کی زیادتی سے آپ اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ آپ کی تعداد اگر فریق ثانی کی تعداد کا نصف ہے تو آپ دگنی محنت کا ثبوت دے کر زندگی کے میدان میں اس کے برابر ہو سکتے ہیں۔

زندگی کی جدوجہد میں کبھی کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے ہو جاتا ہے۔ کوئی غالب ہو جاتا ہے اور کوئی مغلوب۔ مگر اس دنیا کے امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ کبھی کسی کے لئے حد نہیں آتی۔ یہاں ہر پچھڑے ہوئے کے لئے دوبارہ آگے بڑھنے کا امکان ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی زیادہ بڑی مقدار میں عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

ایک حدیث

عن ابی ذرّ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ: انی اری مالا ترون واسمع مالا تسمعون اطّت السماء وحُقّ لہا ان تئطّ۔ ما فیہا موضع اربع اصابع الا وملک واضع جبہتہ ساجداً للہ تعالیٰ۔ واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا وما تلذذتم بالنساء علی الفرش۔ ولخرجتم الی الصعدات تجأرون الی اللہ تعالیٰ۔

وفی روایۃ ان اباذر قال، لو ددت انی کنت شجرۃ تعضد (ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے ا میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان میں چرچراہٹ ہو رہی ہے اور اس کے لئے حق ہے کہ اس میں چرچراہٹ ہو۔ آسمان میں کوئی چار انگل جگہ بھی نہیں مگر یہ کہ وہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہو اللہ کو سجدہ کر رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ اور بستر پر تمہارے لئے عورتوں میں لذت نہ رہ جاتی۔ او تم خدا کو پکارتے ہوئے میدانوں کی طرف نکل جاتے ایک روایت کے مطابق، حضرت ابوذر نے یہ بیان کرنے کے بعد کہا: میری تمنا ہے کہ میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

اس حدیث میں پیغمبر کا جو حال بتایا گیا ہے وہی داعی کا حال ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کیفیت میں آخری کمال کے درجہ پر ہوتا ہے اور عام داعی اپنی اپنی استعداد کے درجہ پر۔

خدا کا داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ غیب اس کے لئے شہود کا حاصل کر لے۔ جو اپنے تصور کی آنکھ سے ان چیزوں کو آج ہی دیکھ لے جن کو موت کے بعد ہر آدمی ا پیشانی کی آنکھ سے دیکھے گا۔

لوگ عالم ظاہر میں الجھے ہوتے ہیں پھر وہ عالم غیب کی خبر دینے والے کیسے بن سکتے ہیں۔ لوگ خ سے دور ہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبان سے معانی کا وہ چشمہ جاری ہو جو خدا سے قریب ہونے کے ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

۔یہی موجودہ زمانہ میں ہمارے مسئلہ کا آغاز ہے اور یہی ہمارے مسئلہ کا اختتام بھی۔ لوگوں کو مندروں اور گرجاؤں کی گھنٹیاں اس لئے سنائی دیتی ہیں کہ ابھی صور اسرافیل کی چنگھاڑ سے ان کے کان کے پردے نہیں پھٹے۔ سڑک پر انسانوں کا جلوس ان کو اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ فرشتوں کی فوج نے ابھی ان کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا۔ معاشی اور سیاسی امتیاز کی شکایت لوگ اس لئے کر رہے ہیں کہ قیامت کے اس ہولناک دن سے ابھی تک وہ باخبر نہیں ہوئے جب کہ خوراک کا ایک دانہ نہیں ہوگا جس کو لوگ کھائیں اور پانی کا ایک قطرہ نہیں ہوگا جس سے لوگ اپنے حلق کو ٹھنڈا کریں۔

لوگ انسان کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے چھیڑے ہوئے مسائل کی خبر نہیں۔ لوگ الفاظ کا کمال دکھا رہے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ ابھی تک معانی کی گہرائیوں سے آشنا نہیں ہوئے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں کیوں کہ بڑے بڑے معاملات کو ابھی تک انھوں نے جانا ہی نہیں۔ آہ وہ انسان جو جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ حالانکہ وہ ابھی تک یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا۔

داعی بننے کے لئے پیغمبر کے مقام پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس عظیم مقصد کے لئے اٹھنا ہے جس کے لئے فرشتے اترے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ یہ کوئی قومی لیڈری نہیں، یہ انسان کی سطح پر خدا کی نمائندگی ہے۔

داعی بننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذاتی تقاضوں کو بھول جائے۔ وہ قومی خواہشات کو نظرانداز کر دے۔ وہ ہر دوسرے جھگڑے اور مطالبے سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے۔ وہ انسانوں کا خیر خواہ بنے، خواہ لوگ اس کو گالیاں دیتے ہوں۔ وہ قوموں کی ہدایت کے لئے تڑپے، خواہ قوموں نے اس کے اوپر ظلم کا آرہ چلا رکھا ہو۔ اس کو دوسروں کے لئے سراپا رحم بننا پڑتا ہے تاکہ خدا اس کے لئے سراپا رحم بن جائے۔

دعوت کی لازمی شرط صبر ہے۔ دنیا میں داعی اور مدعو کے درمیان طرح طرح کے مادی جھگڑے ہوتے ہیں۔ مگر داعی کو بلا شرط تمام مادی جھگڑوں کو ختم کرنا پڑتا ہے تاکہ مدعو اس کے دینی پیغام کو سنے۔ اس کو یک طرفہ طور پر تمام نقصانات پر راضی ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا بن سکے۔ خلاصہ یہ کہ اس کو دنیا کی آگ میں جلنا پڑتا ہے تاکہ خدا اس کو آخرت کی آگ سے بچالے۔

طلاق کا مسئلہ

خاندان ایک بے حد پیچیدہ مجموعہ ہے۔ خاندانی زندگی کا نظام مختلف اور متنوع پہلوؤں کے درمیان تناسب قائم کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ اس تناسب میں اگر معمولی فرق پڑ جائے تو پورا مجموعہ بگڑ کر رہ جائے گا۔

اس کی ایک مثال مغرب کے وہ قوانین ہیں جو نکاح اور طلاق کے روایتی نظام میں اصلاح کے نام پر بیسویں صدی میں بنائے گئے۔ ان قوانین میں سے ایک یہ تھا کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دے تو مطلقہ بیوی کو اسے بھاری رقم دینی پڑے گی، حتی کہ اس کی آخر عمر تک اس کا گذارہ بھی اسے ادا کرنا ہوگا۔

یہ قانون بظاہر عائلی زندگی میں اصلاح کی خاطر بنایا گیا تھا مگر وہ مغرب کے لیے الٹا پڑا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں انہیں اس کی بہت بڑی قیمت دینی پڑتی ہے تو لوگوں میں نکاح کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عورت اور مرد نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگے۔ چنانچہ مغرب کی جدید نسل میں ۵۰ فی صد سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو غیر منکوحہ بیویوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

برٹرینڈ رسل ایک انتہائی ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز تھا۔ اس نے ایک کے بعد ایک تین شادیاں کیں۔ مگر ذہنی موافقت نہ ہونے کی وجہ سے تینوں کو طلاق دینا پڑا۔ یہ طلاق اس کو بہت مہنگا پڑا۔ طلاق کے بعد اس کو اپنی بیویوں کو جو رقم ادا کرنی پڑی اس نے اس کی معاشیات کو برباد کر دیا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

> . . . the financial burden was heavy and rather disturbing: I had given £ 10,000 of my Nobel Prize cheque for a little more than £ 11,000 to my third wife, and I was now paying alimony to her and to my second wife as well as paying for the education of my younger son. Added to this, there were heavy expenses in connection with my elder son's illness; and the income taxes which for many years he had neglected to pay now fell to me to pay. Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks (London), 1978, pp. 563–64

مالیاتی بوجھ میرے اوپر بہت بھاری اور پریشان کن تھا۔ مجھے اپنے نوبل انعام کے گیارہ ہزار پاؤنڈ میں سے دس ہزار پاؤنڈ اپنی تیسری بیوی کو دے دینا پڑا۔ اور اب میں اس کو اور اپنی دوسری بیوی کو نان نفقہ کی رقم بھی ادا کر رہا تھا اور اسی کے ساتھ اپنے چھوٹے بچے کی تعلیم کی ادائیگی بھی میرے ذمہ تھی۔ مزید اضافہ یہ کہ میرے بڑے لڑکے کی بیماری کے سلسلہ میں بھی بھاری اخراجات تھے۔ اور اس کا کئی سال کا انکم ٹیکس جو وہ ادا نہیں کر سکا تھا وہ بھی مجھ ہی کو

ادا کرنا پڑا۔

مطلقہ بیویوں کو بھاری ادائیگی برٹرینڈرسل کے لیے اتنی مہنگی پڑی کہ اس کے بعد اس نے نکاح کا طریقہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ مستقل طور پر ایک عورت اس کے ساتھ رہی جس کو وہ اپنی آٹو بیا گریفی میں "میری بیوی" (My wife) کہتا ہے۔ مگر اس کی یہ بیوی غیر منکوحہ تھی۔ اپنی بعد کی زندگی میں وہ غیر منکوحہ عورت کا شوہر بنا رہا (صفحہ ۵۶۳)

اسلام کا قانون

خاندان یا نکاح و طلاق کے بارہ میں اسلام کا قانون زندگی کے مختلف پہلوؤں کی متناسب رعایت پر مبنی ہے۔ اسلام ہر پہلو کی پوری رعایت کرتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ ایک پہلو کی رعایت کرتے ہوئے دوسرا پہلو مجروح ہو جائے۔

عورت اور مرد جب نکاح کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں تو اسی نیت سے منسلک ہوتے ہیں کہ وہ مستقل طور پر اس کو نبھائیں گے۔ مگر مختلف اسباب سے دونوں یا کسی ایک کو کبھی علیٰحدگی کا ناخوش گوار فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موقع کے لیے اسلام نے واضح احکام دیئے ہیں۔ ان احکام کا مدعا یہ ہے کہ رشتہ کی علیٰحدگی خوش گواری کے ساتھ ہو۔ اسی کے ساتھ ایک ضروری مدت تک شوہر اپنی مطلقہ بیوی کے گزارہ کا ذمہ دار رہے۔ عام حالات میں تقریباً تین مہینہ تک اور حاملہ ہونے کی صورت میں کسی قدر لمبی مدت تک۔

اس مدت کے ختم ہونے کے بعد مرد کے اوپر مطلقہ بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری نہیں رہتی۔ یہ اصول مرد کے اوپر ایسا غیر فطری بوجھ نہیں ڈالتا کہ وہ نکاح کے طریقہ کو ناقابل برداشت بوجھ سمجھ لے اور غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنے لگے۔

یہ اصول بعض مستثنیٰ حالات میں کسی عورت کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ استثنائی حالت ہے نہ کہ عمومی حالت۔ اور یہ قانون سازی کا مسلّمہ اصول ہے کہ عام قانون ہمیشہ عام حالت کی بنیاد پر بنتا ہے استثنائی حالت کی بنیاد پر کبھی عمومی قانون نہیں بنایا جاتا۔

قانون کسی بھی انداز سے بنایا جائے، اس میں ہمیشہ استثنار کی گنجائش رہتی ہے جس کو دوسرے طریقے سے حل کیا جاتا ہے۔ مطلقہ عورت کے بارے میں بھی استثنائی کیس کو اس کی انفرادی حیثیت میں دیکھا جائے گا اور اخلاقی یا سماجی سطح پر اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی، جیسا کہ دوسرے تمام استثنائی معاملات میں ساری دنیا میں کیا جاتا ہے۔

پہچان

اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام نے بھول کر پہلی رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھ دی۔ قل اعوذ برب الناس قرآن کی آخری سورہ ہے، اور نماز کے لئے حکم ہے کہ اگلی رکعت میں آگے کی سورہ پڑھی جائے نہ کہ پیچھے کی سورہ۔

اب امام صاحب کے سامنے سوال یہ تھا کہ اگلی رکعت میں وہ قرآن سے کیا پڑھیں۔ امام صاحب جب اگلی رکعت میں کھڑے ہوئے تو انھوں نے سورہ الم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس طرح قرآن کی ترتیب باقی رہی۔ کیونکہ آدمی جب قرآن کو پڑھتے ہوئے سورہ قل اعوذ برب الناس تک پہنچتا ہے تو وہ دوبارہ قرآن کے ابتدائی حصہ سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر امام صاحب کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے۔ نماز کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کا عہدہ بڑھا دیا۔

بعض مرتبہ ایک چھوٹا سا واقعہ آدمی کی شخصیت کا تعارف بن جاتا ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ آدمی غبی ہے یا ذہین۔ وہ جوہر والا ہے یا بے جوہر والا۔

اسی سے اس حدیث کو سمجھا جاسکتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ بعض اوقات آدمی کا چھوٹا سا عمل اس کے لئے بڑے بڑے انجام کا سبب بن جاتا ہے۔ امام بخاری کی روایت کے مطابق اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال، ان العبد لیتکلم بالکلمة من رضوان الله تعالیٰ مایلقی لها بالاً یرفعه الله بها درجات وان العبد لیتکلم بالکلمة من سخط الله تعالیٰ لایلقی لها بالاً یهوی بها فی جهنم

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بندہ اللہ کی رضا کا کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کر دیتا ہے۔ اور بندہ اللہ کی ناراضگی کا ایک کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی وجہ سے اللہ اس کو جہنم میں ڈال دیتا ہے۔

حکمت کی بات

امام ابوداؤد (۲۰۲-۲۷۵ھ) قندھار کے قریب سجستان کے رہنے والے تھے۔ وہ امام احمد بن حنبل کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے طویل اسفار کے بعد پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں ان میں سے چار ہزار آٹھ سو حدیثوں کو منتخب کر کے سنن ابی داؤد میں درج کیا۔ تاہم امام موصوف نے لکھا ہے کہ آدمی اگر ان میں سے چار حدیثوں کو پکڑ لے تو وہ اس کے دینی فہم کے لئے کافی ہو جائے،

انما الاعمال بالنیات	عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔
من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ	بہتر اسلام یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ بات بولنا چھوڑ دے
لا یکون المومن مومنا حتی یرضی لاخیہ ما یرضاہ لنفسہ	کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
الحلال بیّن والحرام بیّن وبین ذالک امور مشتبہات فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ	حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہہ کی چیزیں ہیں جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو بچالیا۔

امام ابوداؤد کے بہت سے نہایت قیمتی اقوال ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

الشہوۃ الخفیۃ حب الریاسۃ	پوشیدہ شہوت یہ ہے کہ آدمی سرداری کو پسند کرنے لگے۔
خیر الکلام مادخل الاذن بدون اذن	بہترین بات وہ ہے جو کان میں بلا اجازت داخل ہو جائے۔
من اقتصر علی لباس دون ومطعم دون اراح جسدہ	جس شخص نے کمتر لباس اور کمتر کھانے پر قناعت کی اس نے اپنے جسم کو آرام پہنچایا۔

ایمان اگر آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ پیدا ہو جائے تو وہ ساری اہمیت صرف حقیقت کو دینے لگے گا۔ بے فائدہ باتوں سے اسے دلچسپی نہ رہے گی۔ اپنے اور غیر کا فرق اس کی نظر میں ختم ہو جائے گا۔ اس کی حساسیت اتنی بڑھ جائے گی کہ وہ شبہہ کی چیزوں سے بھی بچنے لگے گا۔ اور اپنے کو بڑا بنانے کا جذبہ اس کے اندر باقی نہ رہے گا۔ وہ ایسی بات بولے گا جو سیدھی لوگوں کے دلوں تک پہنچے۔ اس کی زندگی بالکل سادہ زندگی بن جائے گی۔

اکابر قوم

قدیم مکہ کے لوگوں نے محمد بن عبد اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اس سے کم سمجھا کہ خدا انھیں اپنے پیغام کی پیغام بری کے لئے چنے۔ چنانچہ انھوں نے آپ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کا کلام اگر اترنا تھا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا (وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم، الزخرف ۳۱)

دو بڑے آدمیوں سے ان کی مراد مکہ کے ولید بن مغیرہ اور طائف کے عروہ بن مسعود ثقفی سے تھی۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۲۷) تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد طائف کا محاصرہ کیا۔ مگر محاصرہ فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکا۔ چنانچہ آپ محاصرہ ختم کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت مذکورہ عروہ بن مسعود کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حقیقت ڈال دی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچنے سے پہلے آپ سے جا ملے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ اپنی قوم میں واپس جائیں اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تم سے جنگ کریں گے۔ عروہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول میں ان کا سردار ہوں اور وہ مجھ کو اپنی آنکھ سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں (انا احب الیھم من ابصارھم وکان مطاعاً فیھم)

چنانچہ وہ طائف واپس آئے۔ انھوں نے طائف والوں کو جمع کیا اور ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ اس کے جواب میں لوگوں نے یہ کیا کہ ہر طرف سے ان کو تیروں سے مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک تیر ان کے نازک مقام پر لگا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ (مکاتیب الرسول، تالیف علی بن حسینعلی الاحمدی، صفحہ ۲۷۰)

قوم کے اکابر در اصل قوم کا ساتھ دینے کی وجہ سے اکابر بنتے ہیں۔ اگر وہ قوم کی خواہشوں کا ساتھ نہ دیں تو قوم انھیں رد کر دے بلکہ وہ انھیں ہلاک کر ڈالے۔ عروہ بن مسعود حق کا ساتھ دینے سے پہلے اکابر کا درجہ رکھتے تھے، حق کا ساتھ دیتے ہی وہ اصاغر میں شمار کئے جانے لگے۔

ایران کا سبق

سابق شاہِ ایران محمد رضا پہلوی (۱۹۸۰ - ۱۹۱۹) کے خلاف آیات اللہ خمینی کی قیادت میں جو تحریک چل رہی تھی، اس کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۷۸ میں شاہ کو ایران چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ مختلف ملکوں میں پھرتے رہے۔ یہاں تک ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو قاہرہ کے اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ خمینی ایک فاتح کی حیثیت سے پیرس سے تہران آئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایران میں "اسلامی جمہوریہ" کی بنیاد رکھی۔ الرسالہ کی رائے اوّل دن سے یہ رہی ہے کہ ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب نہیں، وہ صرف منفی نوعیت کا ایک مخالف شاہ انقلاب ہے۔ مگر مسلمان جو موجودہ زمانہ میں خوش فہمیوں میں جینے کے عادی ہو گئے ہیں، انہوں نے اس کو اسلام کی فتح قرار دیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بیان دیا کہ "ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے" شاہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان نے ایران کی نئی قیادت کو مبارکباد کا تار بھیجا۔ یہ تار اور اس کا ایرانی جواب یہاں مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔

مگر جلد ہی کھلا کہ ایران کا انقلاب محض ایک انتقامی انقلاب تھا نہ کہ اسلامی انقلاب۔ چنانچہ حکومت پر قبضہ ملتے ہی خمینی گروپ نے ایران کے شہریوں کو گولی مارنا شروع کیا۔ بے شمار لوگ انتقامی جذبات کی تسکین میں مار ڈالے گئے۔ تاہم مولانا مودودی کی جماعت کے پاس اس کی توجیہ موجود تھی ـــــ یہ سب اسلام دشمن ہیں جو قتل کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ میں ایران اور عراق میں جنگ چھڑ گئی۔ وہ اتنی بڑھی کہ پانچ سال گزرنے پر بھی اس کے خاتمہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ اس بربادی اور قتل کو دیکھ کر دنیا بھر کے لوگ چیخ اٹھے۔ اب مولانا مودودی کی جماعت کو اعلان کرنا چاہیے تھا کہ ان کے قائد نے حالات کو سمجھنے میں بھیانک غلطی کی۔ انہوں نے انتقامی ہنگامے کو اسلامی انقلاب سمجھ لیا۔ مگر ان کی خوش قسمتی سے دوبارہ انہیں ایسے الفاظ مل گیے جن کے ذریعہ وہ اپنی غلطی کو دوسرے کے خانہ میں ڈال سکیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کے جنرل سکریٹری قاضی حسین احمد صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا: ایران۔ عراق جنگ عالم اسلام کے خلاف سازش ہے۔ اس جنگ میں عالم اسلام کے وسائل تباہ ہو رہے ہیں۔

(روزنامہ وفاق لاہور، ۹ جون ۱۹۸۵)

لوگ جھوٹے الفاظ میں جینے ہیں۔ حالاں کہ مومن وہ ہے جو حقائق میں جینے لگے۔

IRAN
PRESS RELEASE

December 14, 1978

Text of the

TELEGRAM FROM THE JAMAAT ISLAMI OF PAKISTAN TO DR. EBRAHIM YAZDI

Jamaat Islami Pakistan supports the cause of Islam and freedom of Muslim People. Islam we are whole heartedly with Islamic Movement of Iran. We condemn the atroci and barbarious activities of Shah and his stooges. We and the peoples of Pakistan with you. May Allah establish Islamic Republic with soverignty of Allah in Iran.

Maulana Abul Aala Maudoodi
Founder Jamaateislami, Mian Tufail Mohammad
Ameer Jamaateislami Pakistan, Syed Asad
Gilani Ameer Jamaateislami Pakistan, Lahore

* * * * * * * * * * * * * * * * *

December 15, 1978

Text of the

TELEGRAM FROM DR. EBRAHIM YAZDI TO THE JAMAAT ISLAMI OF PAKISTAN

Dear Brothers in Islam:

Assalamo Alaikum Wa Rahmatollah Wa Barakateh

Your kind timely telegraph was received with great appreciation. The heroic struggle of Iranian Muslims and their Islamic Revolutionary Movement under the unified political and religious leadership of our beloved leader Imam Khomeini, has succeeded tremendously in defeating the Taquti regime of the Shah and his foreign supporters. Victory is closer than ever before. I pray to Allah Sobhana Wa Taalla that the struggle and solidarity of Muslim Ummat, especially the devoted Muslims of Pakistan, will bring prosperity and Filah for Muslim Brothers throughout the world.

With many thanks, Wa Assalm
Your brother in Islam,

Ebrahim Yazdi

اسلامی دعوت

قرآن کی ایک سورہ میں قرآنی دعوت کا خلاصہ ان لفظوں میں آیا ہے:

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ و ابراھیم الذی وفی۔ الا تزر وازرۃ وزر اخری وان لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ وان سعیہ سوف یُریٰ ثم یجزہ الجزاء الاوفی۔ وان الیٰ ربک المنتھیٰ (النجم ۳۶-۴۲)

کیا اس کو اس کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے جس نے پوری تعمیل کی۔ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کیا یا۔ اور یہ کہ انسان کی سعی جلد دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ تیرے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے۔

ان آیات میں جو انداز دعوت ملتا ہے اس کا نمونہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تقریروں میں بھی موجود ہے۔ مثلاً آپ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو آپ نے اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:

فمن استطاع ان یقی وجھہ من النار ولو بشق من تمرۃ فلیفعل ومن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ (سیرۃ ابن ھشام، جزء ثانی ۱۱۸)

جو شخص اپنے چہرہ کو آگ سے بچا سکے وہ بچائے، خواہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ ہو۔ اور جو شخص یہ بھی نہ پائے تو ایک پاک بول کے ذریعہ۔

صحابۂ کرام کی تبلیغ کا انداز بھی یہی تھا۔ مثال کے طور پر عمرو بن میمون اَودی کہتے ہیں:

قام فینا معاذ بن جبل فقال: یا بنی اود، انی رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیکم۔ تعلمون ان المعاد الی اللہ الی الجنۃ او الی النار (مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث، صفحہ ۴۰۴)

معاذ بن جبلؓ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اے بنی اَود، میں تمہاری طرف خدا کے رسول کا بھیجا ہوا قاصد ہوں۔ جان لو کہ خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ لوٹنا یا جنت کی طرف ہوگا یا آگ کی طرف۔

اسلامی دعوت در اصل خدا اور آخرت کی یاد دہانی ہے۔ انسان کو خدا سے جوڑنا اور آخرت کی پکڑ کا زندہ احساس پیدا کرنا ہی وہ اصل کام ہے جس پر اسلامی دعوت مرتکز رہتی ہے۔

تیسرا سفر

لاہور کے لئے میرا تیسرا سفر مارچ ۱۹۸۵ کے آخری ہفتہ میں ہوا۔ ۲۳ مارچ کو دہلی سے لاہور کے لئے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۲۷۱ سے روانہ ہوا۔ پاکستانی ہوائی کمپنی سے سفر کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ پاکستان ایئرویز کا سفر اکثر پہلوؤں سے دوسرے ہوائی جہازوں جیسا تھا۔ تاہم بعض پہلوؤں سے وہ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ اناؤنسر کے اعلانات میں السلام علیکم، انشاء اللہ اور خدا حافظ جیسے کلمات سننے کو ملے۔ خاتون اناؤنسر خالص کتابی اردو بول رہی تھی۔ اسی طرح ہوائی جہاز اور ہوائی اڈہ کے اندراجات میں انگریزی کے ساتھ اردو بھی ہر جگہ لکھی ہوئی نظر آئی۔

اپنے ہوائی سفر میں غالباً پہلی بار مسلمان ہوا باز کا نام سننے میں آیا۔ یہ کیپٹن فاروق تھے۔ انھوں نے ۶۸۰۰ میٹر کی بلندی پر جہاز کو اڑاتے ہوئے ۴۵ منٹ میں اس کو لاہور کے ہوائی اڈہ پر اتارا۔ واپسی میں ۲۸ مارچ کو جہاز کے کپتان مسٹر عبد القادر تھے۔ لاہور سے دہلی تک پوری پرواز غیر معمولی طور پر ہموار تھی۔ حتی کہ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی سواری میں چل رہے ہیں یا گھر کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔

جہاز کے بیشتر مسافر مسلمان تھے۔ تاہم میرے قریب کی دو نشستوں پر ایک یوروپین جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی عام حالت کے برعکس وہ لوگ اتنا آہستہ بول رہے تھے کہ بمشکل ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ واحد چیز جس سے وہ مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہے تھے وہ ان کے سگریٹ کا دھواں تھا۔ میں سگریٹ کے بارہ میں اتنا زیادہ حساس ہوں کہ ہوا میں اس کی ادنیٰ آمیزش بھی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ تاہم سفر پر نکلنے کے بعد اس سے بچنا ممکن نہیں۔ "نان اسموکنگ زون" میں نشست حاصل کرنا بھی اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ آدمی برداشت کرے یا وہ سفر ہی نہ کرے۔

اڑان کے دوران ہوائی جہاز کے اندر ناشتہ آیا تو عام قاعدہ کے خلاف اس میں صرف چمچہ تھا "چھری کانٹا" نہ تھا۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ اسلامیت تھی یا کفایت شعاری۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۵ کی سہ پہر کو میں پاکستان کے لئے روانہ ہوا تو آج کے دو واقعات کی یاد میرے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ آج صبح فجر کی نماز میں نے نظام الدین کی اس مسجد میں پڑھی جس کو عام طور پر کالی مسجد کہا جاتا ہے۔ ایک تبلیغی اجتماع کی وجہ سے آج نمازیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔

نماز کے بعد امام صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مسجد کے لئے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہوئے یہ بتایا

کہ یہ عظیم مسجد سات سو سال پہلے فیروز شاہ تغلق نے بنوائی تھی۔ انگریزوں کے زمانہ میں یہ محکمۂ آثار قدیمہ کے قبضہ میں چلی گئی۔ آزادی کے بعد ہم نے اس کی رہائی کی کوشش شروع کی۔ اس سلسلہ میں گرفتاریاں ہوئیں۔ مقدمہ چلا۔ امام صاحب نے کہا کہ آپ تعجب کریں گے کہ مسجد کے اس مقدمہ میں ہمارے حق میں تین غیر مسلم اصحاب نے گواہی دی۔ ایک ہریجن، ایک بنیا اور ایک برہمن۔ ان لوگوں نے عدالت میں جاکر بیان دیا کہ ہم ۳۰ سال سے مسلمانوں کو یہاں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر عدالت نے یہ قدیم شاہی مسجد مسلمانوں کو واگزار کردی۔ اس کے بعد کئی لاکھ روپے کے خرچ سے اس کی مرمت کرائی گئی اور اس کو اس شاندار صورت میں تبدیل کیا گیا جیسا کہ آپ آج اسے دیکھ رہے ہیں۔

فجر کی نماز پڑھ کر مکان واپس آیا تو آج کے اخبارات موجود تھے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ مارچ ۱۹۸۵) میں مسٹر خشونت سنگھ کا کالم تھا۔ اس میں انھوں نے لندن میں سابق ہندستانی ہائی کمشنر مسٹر سید محمد کی فروری ۱۹۸۵ میں وفات پر ایک لمبا نوٹ لکھا تھا، اس نوٹ میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ پیراگراف بھی تھا:

> The conventional period of mourning prescribed for the dead in Muslim families is forty days. In the case of Valiaveetil Abdul Aziz Syed Mohammad who died last month it will last much longer. Besides his comely wife Thangam, their children and friends amongst whom I count myself, the period of mourning will be our lifetimes. He was a good, able and honest man. Such men are rare. Their going leaves a void in many hearts that remains forever unfilled.

میں ہندستان سے پاکستان جارہا تھا اور میرے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جب ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتنے گہرے تعلقات تھے کہ بے شمار ناخوشگواریوں کے باوجود آج بھی وہ اتنی گہرائی کے ساتھ باقی ہیں، اس ملک کو دو قومی بنیاد پر تقسیم کرایا گیا تو آخر کس لئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں قرار داد پاکستان منظور کی گئی تھی۔ اس تاریخی نسبت کی بنا پر پاکستان کی نئی منتخب پارلی منٹ (مجلس شوریٰ) کا افتتاحی اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ کو رکھا گیا۔ ۲۳ مارچ کی شام کو جب میں لاہور پہنچا تو ٹیلیویژن پر جنرل محمد ضیاء الحق کی تقریر آرہی تھی۔ صدر پاکستان نے اپنی افتتاحی تقریر کا آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات   مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

انھوں نے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جس میں ۳۲۴ ممبران شریک تھے اور جو پاکستان کے نو کرور باشندوں کے نمائندہ تھے کہا کہ جوں ہی نئی حکومت نے امور مملکت پر اپنی گرفت مستحکم کرلی تو مارشل لا کی چھتری فوری طور پر لپیٹ لی جائے گی۔ کیوں کہ ارکان اسمبلی اور سینٹ کی شکل میں اتنے سارے مسیحا اکھٹا ہو گئے ہیں تو یقیناً مریض بہت جلد صحت یاب ہوجائے گا اور مارشل لا کی کڑوی گولی کو ترک کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ نفاذ اسلام کی رفتار کو تیز کرنا، اور عام آدمی کے روزمرہ کے مسائل ارکان شوریٰ کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ قومی اسمبلی اور سینٹ عوام کی توقعات پر پوری اتریں گی اور قوم کو اتحاد، استحکام اور خوشحالی کی طرف لے جائیں گی۔

اس تقریر کا ایک دلچسپ حصہ یہ تھا کہ "صدر ضیاالحق نے پارلی منٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایوان کو چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے اس پر غور کرے کہ بیشتر ارکان اسمبلی قانونی حد سے کہیں زیادہ خرچ کر کے ایوان میں پہنچے ہیں"۔ (نوائے وقت لاہور، ۲۴ مارچ ۱۹۸۵)

پاکستان میں مارچ ۱۹۸۵ میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مارشل لا حکومت کے تحت الکشن کمیشن نے یہ ہدایت نامہ جاری کیا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے امیدواروں کو ۲۵ ہزار روپے اور قومی اسمبلی کے امیدواروں کو ۴۰ ہزار روپے تک انتخابی مہم پر صرف کرنے کی اجازت ہوگی (جنگ ۹ فروری ۸۵) مگر عملاً جو ہوا وہ یہ تھا کہ مبصرین کے اندازے کے مطابق قومی اسمبلی کے امیدوار نے اوسطاً دو لاکھ سے پانچ لاکھ روپے انتخابی مہم پر صرف کیے۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی کے امیدوار نے اوسطاً ایک لاکھ سے پانچ لاکھ روپے انتخابی مہم پر صرف کیا (امروز ۲ مارچ ۱۹۸۵) ایک اندازہ کے مطابق ملک بھر میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے چار ہزار امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور انتخابی مہم پر مجموعی اعتبار سے چالیس کرور روپے خرچ کئے۔ اخبار حریت (۹ فروری ۱۹۸۵) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ کراچی کے حلقہ نمبر ۱۸۹ میں قومی اسمبلی کے ایک مضبوط امیدوار کو پیشکش کی گئی کہ اگر وہ امیدواری سے دست بردار ہوجائیں تو انھیں پندرہ لاکھ روپے کی ادائگی کی جائے گی۔

پاکستان کے الکشن کے دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ "دین دار" افراد نے آپس میں سخت مقابلہ کیا جس کی وجہ سے دین پسند ووٹ بٹ کر ان کی طاقت کمزور ہوگئی۔ مثال کے طور پر کراچی کے حلقہ نمبر ۱۹۱ میں محمود اعظم فاروقی اور شاہ بلیغ الدین کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ اسی طرح لاہور میں مولانا ابوالاعلیٰ

مودودی کے صاحبزادہ اور جماعت اسلامی کے ایک رکن کے درمیان مقابلہ ہوا۔

پاکستان کے لوگوں کو بعض چیزیں قدرتی نعمت کے طور پر حاصل ہیں۔ یہاں کا جغرافیہ (خاص طور پر پنجاب کا) صحت اور زرعی پیداوار کے لئے نہایت موزوں ہے۔ سوئی گیس نے ان کے لئے ایندھن کے مسئلہ کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔ یہاں آدمی کو سلنڈر حاصل کرنے کے مشکل مراحل سے گزرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پانی کے پائپ کی طرح گھروں میں کوکنگ گیس کے پائپ لگے ہوئے ہیں۔ جتنا چاہے استعمال کیجئے اور میٹر کے مطابق قیمت ادا کر دیجئے۔

ایک بار میں نے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ سنا ہے کہ یہاں کوکنگ گیس کی افراط کی وجہ سے لوگ اپنے چولھے کو بالکل بند نہیں کرتے بلکہ کھانا پکانے کے بعد گیس کو کم کر کے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ دوسرے وقت انھیں دیاسلائی یا لائٹر جلانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ ایک صاحب نے تصدیق کی۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ سارے لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اور اس میں بہت کم گیس جلتی ہے۔ بس ذرا سی چراغ کی لو کی طرح۔ یہ حال اس قوم کا ہے جس کے پیغمبر نے یہ تعلیم دی تھی کہ پانی میں بھی اسراف نہ کرو خواہ تم بہتے ہوئے دریا کے کنارے کیوں نہ ہو (ولو کنت عند نھر جار)

بعض پاکستانی حضرات نے بتایا کہ حکومت کی اطلاع کے مطابق یہاں پورے ملک میں ۵۵ ہزار مسجدیں ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ "میں نے خود کتنی مسجدیں دیکھی ہیں کہ وہ بند پڑی رہتی ہیں۔ پانچ وقت میں سے ایک وقت بھی وہاں نماز نہیں ہوتی"۔ میں نے سوچا کہ غیر ملک کا محکمہ آثار قدیمہ اگر کسی مسجد کو بند کر دے تو فوراً اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ اور خود اپنے ملک میں مسلمان اگر مسجد کو بند رکھیں تو اس سے اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

اخبار میں ایک خبر یہ پڑھی کہ ۲۳ مارچ کو چنیوٹ میں نماز استسقا ادا کی گئی۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہاں کے ایک معمر بزرگ نے کہا کہ پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس موسم میں قلت مطر پیش آیا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ پہلے جب استسقا کی نماز ہوتی تھی تو عوام امنڈ پڑتے تھے۔ اب تو بہت کم لوگ استسقا کی نماز میں آتے ہیں"۔ یہ حال صرف پاکستان کا نہیں۔ آج تمام مسلم دنیا کا یہی حال ہو رہا ہے۔

یہاں گھروں اور دفتروں میں عام طور پر دو تصویریں ضرور ہوتی ہیں۔ مسٹر جناح اور علامہ اقبال

میرے ایک سوال کے جواب میں ایک صاحب نے کہا کہ اقبال نے نہ صرف پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ بلکہ ان کی شاعری نے بالواسطہ طور پر اس کا ذہن بنایا۔ ایک انگریزی اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں تین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر علامہ اقبال کی تصویر۔ اس کے نیچے مسٹر جناح کی۔ اس کے نیچے لیاقت علی خاں کی۔ تینوں تصویروں کے سامنے بالترتیب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

He thought
He fought
He Sacrificed

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ پاکستان میں اسلام کی کون سی خصوصیت نسبتاً زیادہ زندہ ہے۔ انھوں نے فوراً کہا "عید میلاد النبی" ہر سال یہاں کے مسلمان اتنی دھوم سے اور ایسے عجیب عجیب طریقے سے میلاد النبی کا جشن مناتے ہیں جس کو صرف دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کروروں روپئے خرچ کیے جاتے ہیں۔ جشن اور دھوم اور ہنگاموں والا اسلام آج دنیا بھر کے مسلمانوں پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ وہ خاموشی والا اسلام جانتے ہی نہیں۔

۲۵ مارچ کو مولانا مظفر حسین ندوی مظفر آبادی (۶۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کئی برس تک دہلی میں کاشف العلوم میں مقیم رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ میں وہ دیوبند گئے۔ وہاں وہ مولانا حسین احمد مدنی کے درس حدیث میں شریک ہوئے۔ بخاری کا درس ہو رہا تھا۔ درس ختم ہوا تو ایک طالب علم نے سوال کیا کہ ـــــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے۔ اس جماعت کا مقصد اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ آپ کی رائے اس جماعت کے بارہ میں کیا ہے۔ مولانا مدنی نے جواب دیا:

> کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کو چھوڑ کر جو کوئی بھی جماعت ہندستان میں بنے گی وہ اس ملک میں انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے والی ثابت ہوگی۔

میں نے مولانا مظفر حسین ندوی سے پوچھا کہ اس جملہ سے مولانا مدنی کا مقصد کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس سے جو بات سمجھی وہ یہ تھی کہ دوسری بنیادوں پر جماعت بنانے سے مسلمانوں کی توجہ ہٹ جائے گی اور انگریزوں کے خلاف جو سیاسی جدوجہد جاری ہے وہ کمزور پڑ جائے گی۔

پاکستان میں اگرچہ مارشل لا نافذ ہے۔ مگر یہاں کا مارشل دوسرے ملکوں کے مارشل سے کافی

مختلف نظر آتا ہے۔ مارشل لا کے باوجود لوگوں میں کوئی خوف وہراس نہیں۔ مجلسوں اور اخباروں میں کھلے عام ہر طرح کے تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر نوائے وقت (جو یہاں کا آزاد اخبار سمجھا جاتا ہے) اس کی اشاعت ۲۵ مارچ کی پہلی سرخی یہ تھی:

سول حکومت اور مارشل لا ایک ساتھ نہیں چل سکتے

اندر کے صفحے میں ایڈیٹوریل کا عنوان تھا "نئے دور کا آغاز، جمہوریت یا مارشل لائی جمہوریت" اخبارات میں صدر ضیاء الحق سے زیادہ نمایاں تصویریں عورتیں اور کھلاڑیوں کی نظر آئیں۔

پاکستان میں ایک عجیب طبقہ ابھر رہا ہے جس کا نام ہے "نوجوان شاعرات" ایک خاتون کالم نگار نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ پاکستان کی حساس طبع خواتین میں روز بروز شاعری کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ خواتین کی اکثریت جو شاعری سے اپنا دل بہلانے کا کام لیتی ہے، چند غزلیں یا نظمیں لکھنے کے بعد ان کو کتابی شکل میں چھپوانے میں بہت جلد بازی کرتی ہے۔"

مولانا عبد الغفار حسن صاحب فیصل آباد کی جامعہ تعلیمات میں حدیث کے استاذ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس مدرسہ میں منطق کا جزء بہت کم رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک عالم کا قول نقل کیا کہ طالب علم اگر ذکی ہے تو اس کو منطق کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ غبی ہے تو وہ منطق کو سمجھے گا نہیں۔

دوسرے اکثر شہروں کی طرح لاہور بھی دو لاہور کا نام ہے۔ ایک قدیم لاہور۔ یہاں تنگ سڑکیں پرانے مکانات، ٹریفک کی بھیڑ کا وہی منظر ہے جس کی مثال پرانی دہلی میں نظر آتی ہے۔ دوسرا نیا لاہور۔ یہاں چوڑی سڑکیں ہیں۔ سرسبز پارک ہیں۔ جدید وضع کے کھلے ہوئے مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی شخص پرانے لاہور میں آئے اور یہیں سے واپس چلا جائے تو وہ یہ تاثر لے گا کہ لاہور نے پچھلے سو سال کے اندر کوئی خاص ترقی نہیں کی ہے۔ لیکن اگر کوئی نئے لاہور کو دیکھے تو وہ یہ یاد لے کر یہاں سے لوٹے گا کہ لاہور جدید دنیا کا ایک اعلیٰ ترقی یافتہ شہر ہے۔ مشاہدہ کے فرق سے رائیں کس طرح بدل جاتی ہیں۔

آزاد ہندستان سیکولرزم کے نام پر وجود میں آیا۔ چنانچہ یہاں کے لیڈر ہمیشہ سیکولرزم کی بات کرتے ہیں خواہ وہ سیکولرزم سے بالکل دور ہوں۔ یہی حال پاکستان کا ایک اور شکل میں ہوا ہے۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں ہر کام اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ سوشلزم کے حامی اس کو اسلامی سوشلزم کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ عورتوں کو گھر سے نکالنے کی تحریک بھی

اسلامی حریت کے عنوان پر چلائی جاتی ہے۔ ایک تاجر اخبار میں اپنا اشتہار دیتا ہے تو اس کا عنوان ہوتا ہے۔ "الحمدللہ ایک اور امتیاز" حتی کہ فلمی لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ اسلام کا لیبل لگائیں۔ روزنامہ نوائے وقت (۲۶ مارچ ۱۹۸۵) میں نئی فلم "ایک دلہن" کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اشتہار کا مضمون ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا:

"انشاء اللہ ماہ اپریل میں نمائش کے لئے پیش کی جائے گی۔"

لاہور کی سڑکوں پر جگہ جگہ ایسے بورڈ نظر آئے جن پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا "نماز قائم کرو"۔ "اتحاد میں برکت ہے" وغیرہ۔ تاہم پاکستان کے اخبارات میں سب سے زیادہ نمایاں مقام فلم اور کھیل کو حاصل ہے۔ نوائے وقت (۲۶ مارچ) میں ترکی کی فلم ایکٹریس نازاں کا انٹرویو تھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"فیشن میں ترکی پر یورپی تہذیب کا زیادہ اثر ہے۔ وہاں خواتین جدید فیشن کے ملبوسات بہت شوق سے زیب تن کرتی ہیں۔ پیرس اور لندن میں جوں ہی کوئی نیا فیشن ایجاد ہوتا ہے ترکی میں اس کی فوری طور پر کاپی کر لی جاتی ہے۔"

عجیب بات ہے کہ پاکستان میں بے شمار اسلامی جماعتیں اور اسلامی تنظیمیں ہیں۔ مگر غالباً کوئی ایک جماعت یا تنظیم ایسی نہیں ہے جس کے پروگرام میں یہاں کے غیر مسلموں تک اسلام پہنچانا شامل ہو۔ پاکستان میں ہندو اور عیسائی قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے تو انھوں نے بے پناہ ہنگامے کئے۔ مگر غیر مسلموں کو اسلام کی رحمت میں داخل کرنے کے لئے کوئی بھی قابل ذکر کوشش اب تک پاکستان میں وجود میں نہ آسکی۔ حالانکہ اسی ملک میں عیسائی زبردست تبلیغی کوشش میں مصروف ہیں۔

یہی حال آج ساری دنیا کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ لوگوں کو جہنم میں ڈالنے کے لئے تو بہت بے قرار ہیں۔ مگر لوگوں کو جنت میں پہنچانے کے لئے ان کے اندر کوئی تڑپ نہیں پائی جاتی۔

پاکستان کے نامزد وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مذہبی آدمی ہیں۔ وہ پیر پگاڑا کے مرید ہیں۔ وہ اپنے پیر کے مکان یا دفتر میں جاتے ہیں تو بغیر جوتوں کے داخل ہوتے ہیں۔ واپسی میں وہ کبھی بھی اپنی پیٹھ کے رخ واپس نہیں آتے۔ چنانچہ یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ پیر پگاڑا پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں کس طرح شرکت کریں۔ کیونکہ اگر پیر پگاڑا

پارلیمنٹ کے اجلاس میں موجود ہوں تو وزیر اعظم محمد خان جنیجو اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے کہ وہ اپنے روحانی پیشوا سے بلند مقام پر بیٹھیں۔

پیر پگاڑا کے لاکھوں مریدوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے پیر صاحب کی موجودگی میں کوئی بھی شخص اس عزت کا مستحق نہیں کہ وہ ان سے اونچی نشست پر بیٹھے۔ اس قسم کا ایک واقعہ سابق صدر ایوب خاں کے ساتھ سانگھڑ (سندھ) کے ایک استقبالیہ میں پیش آچکا ہے۔ صدر ایوب خاں اسٹیج پر پیر پگاڑا سے تقریباً دو انچ اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پیر پگاڑا کے مریدوں کو معلوم ہوا تو وہ ہزاروں کی تعداد میں کھڑے ہو گئے اور احتجاج کرنے لگے۔ بعد کو جب صدر ایوب خاں کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ فوری طور پر مریدوں کے جذبات کے احترام میں اپنی کرسی سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد مریدین خوش ہو گئے۔ انہوں نے ایوب خاں زندہ باد کے نعرے لگائے۔

وزیر اعظم جنیجو کی اہلیہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ پردہ میں رہتی ہیں۔ نوائے وقت (۲۶ مارچ) کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ وزیر اعظم نے اسلام آباد میں اپنی ہونے والی سرکاری رہائش گاہ کا معائنہ کیا۔" وزیر اعظم نے تزئین و آرائش میں کچھ تبدیلیوں کے احکام بھی جاری کئے۔ بالخصوص نماز اور تلاوت قرآن پاک کے لئے ایک جگہ مخصوص کرنے کی ہدایت کی۔"

۲۵ مارچ ۱۹۸۵ کو جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز "منصورہ" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مجموعی طور پر بارہ ایکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ وسیع چہار دیواری کے اندر مسجد، اسکول، اسلامک ریسرچ سنٹر، اسپتال لائبریری، دارالاشاعت، تنظیمی دفاتر، رہائش گاہ وغیرہ بنی ہوئی ہیں۔ درخت اور سبزہ بھی کافی نظر آئے۔ تاہم انتظام کے اعتبار سے وہ عام اداروں سے بہتر محسوس نہیں ہوا۔

جناب نعیم صدیقی صاحب اور دوسرے صاحبان سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ نعیم صدیقی صاحب (۶۹ سال) سے میں نے کہا کہ اپنی زندگی کی کوئی خاص دریافت بتائیے۔ انہوں نے جو بات بتائی وہ میں نے اسی وقت ان سے کاغذ پر لکھوالی۔ موصوف کی دریافت ان کے الفاظ میں یہ تھی:

میرے نزدیک جوہر دین یہ ہے —— دل پاک، دیدہ پاک، دہن پاک

جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نوائے وقت (۲۴ مارچ ۱۹۸۵) میں میں نے سینٹ کے رکن اور جماعت اسلامی پاکستان کے سکریٹری جنرل قاضی حسین احمد صاحب کا

بیان پڑھا تھا جس کی سرخی یہ تھی:

جماعت اسلامی پیش کش ہونے پر بھی حکومت میں شامل نہیں ہوگی۔

میں نے میاں طفیل محمد صاحب سے اس بیان کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے ہم نے تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ موجودہ حالات میں شرکتِ حکومت کا کوئی فائدہ نہیں۔

جماعت اسلامی نے پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے لئے ۶۱ امیدوار کھڑے کئے تھے۔ ان میں رکن اور متفق کو ملا کر صرف آٹھ کامیاب ہوئے۔ میں نے کہا کہ اس سے پہلے آپ حضرات اپنی انتخابی شکست کا ذمہ دار دھاندلی کو بتاتے تھے۔ اس بار خود آپ کی پسندیدہ حکومت نے الکشن کرایا ہے اور آپ کو الکشن لڑنے کا سب سے زیادہ موقع ملا ہے پھر آپ کو شکست کیوں ہوئی۔ میاں طفیل محمد نے بڑا عجیب جواب دیا۔ انھوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو موجودہ الکشن میں شکست ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی پرفخر نفسیات نے انھیں اس عجیب و غریب خوش قسمتی سے ہم کنار کیا ہے کہ وہ اپنی شکست کو بھی اپنی فتح کے خانہ میں ڈال سکیں۔

کچھ لوگ سندھ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ میری کتابوں کا سندھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سندھ میں تیزی سے کمیونزم کا سیلاب آ رہا ہے۔ ان کو اولاً پنجابیوں سے بیزاری ہوئی اور اس کے بعد وہ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ پنجاب سے بیزاری کی ایک مثال انھوں نے یہ دی کہ پی آئی اے (پاکستان انٹرنیشنل ایرویز) کو وہ پنجاب انٹرنیشنل ایرویز کہتے ہیں۔ کمیونزم اور الحاد کی کاٹ کے لئے وہ میری کتابوں کو سندھی زبان میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میرے اندازہ کے مطابق یہ مسئلہ عقیدہ کا نہیں بلکہ مفادات کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مختلف اسباب سے وہ پنجابیوں سے پیچھے ہو گئے۔ فوائد کی تقسیم میں انھیں کم حصہ ملا اور پنجابیوں کو زیادہ۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر ردعمل پیدا ہوا۔ اپنے ردعمل کے اظہار کے لئے انھیں اسلام کا نعرہ زیادہ مفید مطلب نظر نہیں آیا۔ چنانچہ کمیونزم کو اپنے لئے زیادہ مفید مطلب سمجھ کر انھوں نے کمیونزم کا نعرہ اختیار کر لیا۔ انھوں نے میرے اس نقطہ نظر کی تصدیق کی۔

لاہور میں بہت سے لوگوں نے آٹو گراف لئے۔ ایک آٹو گراف مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنی دستخط کے ساتھ انھیں حسب ذیل جملہ لکھ کر دیا:

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مطلوب اعلیٰ سے کمتر کسی چیز میں ضائع کیا جائے۔

لاہور کے قرآنی محاضرات کا عنوان تھا: تصور فرائض دینی۔ مختلف علما نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق مختلف قسم کے خیالات پیش کئے۔ میں نے ۴۵ منٹ کی تقریر میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ دینی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔

۲۶ مارچ کو شام کی نشست میں میں نے ایک مقالہ پڑھ کر سنایا جس کا عنوان تھا "دلائل قرآن" لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور متعدد لوگوں نے اس کی فوٹو کاپی کرا کر اس کی نقل حاصل کی۔

۲۵ مارچ کی شام کو جناب کرامت اللہ شیخ کی رہائش گاہ پر ایک نشست ہوئی۔ اس میں کچھ پروفیسر اور ڈاکٹر حضرات شریک ہوئے۔ گفتگو کے انداز میں اسلامی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ یہ نشست تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔

۲۶ مارچ کی صبح کو مولانا وصی مظہر ندوی اور الانصار المسلمون کے دوسرے ذمہ دار ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ دیر تک ملی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

مختلف ملاقاتوں کے درمیان مجھ کو ایک تجربہ یہ ہوا کہ ہر آدمی اپنے ذہن کو کسی نہ کسی شخصیت سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ہمیشہ اسی کی نسبت سے سوچتا ہے۔ مثلاً ایک بار میں نے ایک بات کہی۔ ایک صاحب نے فوراً کہا "ہاں حضرت تھانوی نے بھی یہی بات اس طرح فرمائی تھی"۔ حالانکہ انھوں نے جو ملفوظ نقل کیا اس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار میں نے کوئی بات کہی تو ایک صاحب فوراً بولے "جی ہاں۔ یہی بات مولانا مودودی نے فلاں موقع پر کہی تھی"۔ حالانکہ جو بات انھوں نے نقل کی وہ ایک اور ہی بات تھی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ صرف شخصیتوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ حقیقتوں کو نہیں جانتے۔ کسی حقیقت کو وہ اس وقت تک سمجھ نہیں پاتے جب تک وہ اس کو اپنی محبوب شخصیت کے ساتھ وابستہ نہ کر لیں۔ ایسے لوگ کبھی حقیقت کو نہیں پاتے۔ ان کے لئے وہ لذت مقدر نہیں جو اس دنیا میں صرف اس شخص کا حصہ ہے جو حقیقت کو براہ راست دریافت کرے۔

ایک طبقہ وہ بھی ہے جو رسول کے معاملہ میں غلو کرتا ہے۔ وہ رسول کو اتنا بڑھانا چاہتا ہے کہ رسول

کا درجہ خدا سے بڑھ جائے یا کم از کم وہ اس کے ہم پلہ ہو جائے۔ اس طبقہ میں جو نادان لوگ ہیں وہ یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ:

اللہ کے پلہ میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے

اور جو لوگ نسبتاً سنجیدہ ہیں وہ دوسرے الفاظ میں سوچتے ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ نے فرمایا: شان کے اعتبار سے قرآن کا درجہ پہلا ہے اور رسول اللہ کا درجہ دوسرا۔ مگر ایمان کے اعتبار سے رسول اللہ کا درجہ پہلا ہے اور قرآن کا درجہ دوسرا۔ کیونکہ قرآن کو ہم رسول اللہ کے کہنے کی وجہ سے مانتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں بے فائدہ لفظ بازی ہیں۔ حقیقت دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

۲۳ مارچ سے ۲۸ مارچ تک یہ پروگرام رہا کہ روزانہ دن کے اوقات میں تنظیم اسلامی کے اجتماعات ہوتے۔ ان میں وہ تمام افراد تنظیم شریک ہوتے تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد محاضرات قرآنی کا سلسلہ شروع ہوتا۔ ان محاضرات کا عنوان تھا: تصور فرائض دینی۔ مختلف طبقہ کے علماء کو اس موقع پر دعوت دی گئی تھی کہ وہ مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ لوگوں کو اس کی بھی پوری آزادی تھی کہ وہ تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے نظریات یا پروگرام پر کھلی تنقید کریں۔

راقم الحروف ہر روز محاضرات قرآن کی نشستوں میں شریک ہوا۔ میرا احساس ہے کہ اصل موضوع پر بہت کم اظہار خیال ہوسکا۔ زیادہ تر لوگوں کی تقریریں واعظانہ انداز میں تھیں۔ تاہم بعض ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے اصل موضوع کا پابند رہ کر اظہار خیال کیا۔

لاہور کی بادشاہی مسجد دیکھی جو اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے بڑی ہے۔ دونوں کا طرز تعمیر اگرچہ ایک ہے۔ مگر دہلی کی مسجد میں جو غیر معمولی تناسب ہے وہ لاہور کی مسجد میں نظر نہ آیا۔ البتہ لاہور کی مسجد میں صفائی اور دیکھ بھال وغیرہ کا انتظام بہت زیادہ ہے۔

مسجد کے اندر کئی کمروں میں تاریخی تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عمامہ، آپ کا عصا، اور جبہ اور موئے مبارک وغیرہ۔ بعد کے بزرگوں کے تبرکات بھی موجود ہیں۔ مجموعی طور پر تبرکات کی تعداد تقریباً ۲۰ ہے۔ ۱۸۵۲ میں لارڈ لارنس کے حکم سے ان تبرکات کی تاریخ لکھی گئی تھی اس کے لکھنے والے سید نور الدین اور سید محمد لطیف تھے۔ انھوں نے تبرکات لاہور نامی کتاب میں تحقیق

کر کے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ تبرکات کس طرح مختلف ہاتھوں میں ہوتے ہوتے یہاں پہنچے۔ یہ تبرکات اپنے آخری مرحلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے انجمن اسلام لاہور کو دے گئے۔

مسجد کے ایک حصہ میں قرآن کا ایک خاص نسخہ نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ سنہرے تاروں سے لکھا گیا ہے۔ عطا محمد مزارات پر چڑھائی جانے والی چادریں تیار کرتے تھے۔ ان کا مکان آتش بازی کے ایک کارخانہ کے اوپر تھا۔ کارخانہ میں آگ لگنے سے ان کا مکان اور بیوی بچے سب ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے عطا محمد کے ذہن میں آیا کہ وہ سنہری تاروں سے قرآن پاک تیار کریں۔ مختلف لوگوں کے تعاون سے انھوں نے دس سال میں یہ قرآن تیار کیا۔ یہ قرآن ۱۳۲۸ صفحات پر ہے۔ اس کی ۳۰ موٹی موٹی جلدیں ہیں۔ وہ ۱۹۷۷ میں اس مسجد میں رکھا گیا۔

مسجد سے متصل سکھوں کی ایک بڑی عمارت ہے۔ اس کے اندر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مقبرہ اور گورودوارہ ہے۔ ہم اس کے اندر داخل ہوئے اور درشن سنگھ سے ملے جو یہاں "سیوا دار" کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ جب ہم ان کے کمرہ میں داخل ہوئے تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اردو زبان کی ایک بڑی کمی یہ تھی کہ اس کا ٹائپ نہیں تھا۔ مگر دور جدید میں کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کو حل کر دیا۔ برطانیہ کی ایک کمپنی نے کمپیوٹر کے ذریعہ اردو ٹائپ سٹنگ کی مشین ایجاد کی ہے۔ یہ مشین کافی مہنگی ہونے کی وجہ سے ابھی عام نہ ہو سکی۔ پاکستان میں کچھ اخبارات (مثلاً جنگ، نوائے وقت) اسی مشین کے ذریعہ چھپتے ہیں۔

تاہم اس کے حروف میں وہ خوبصورتی نہیں جو ہاتھ کی کتابت میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ مشین کی خرابی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ کمپنی کے ذمہ داروں نے حروف تیار کرنے کا کام آرٹسٹ سے کرایا جب کہ یہ کام انھیں خطاط سے کرانا چاہئے تھا۔ انگریزی میں یہ کام چونکہ آرٹسٹ ہی انجام دیتے ہیں اس لئے انھوں نے اردو کے لئے بھی آرٹسٹ کا انتخاب کیا۔ معلوم ہوا کہ کمپنی کے لوگ دوبارہ خطاط کے ذریعہ نئے حروف تیار کرانا چاہتے ہیں۔

لاہور میں ایک میواتی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میواتی قوم کی نصف تعداد پاکستان میں ہے اور نصف تعداد ہندستان میں۔

ان کو حکومت پاکستان سے شکایت تھی۔ انھوں نے کہا کہ میواتی لوگ جب ۱۹۴۷ میں پاکستان

میں داخل ہوئے تو انھوں نے یہاں کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کی پوری آبادی کو ایک جگہ بسایا جائے۔ مگر یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا۔ چنانچہ یہ تمام میواتی مختلف علاقوں میں منتشر ہیں۔

میوات کے لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حکومت نے ایسا کیوں کیا۔ اصل یہ ہے کہ میواتی قوم نے اپنے آپ کو ایک لڑاکا قوم کی حیثیت سے متعارف کیا ہے۔ انھوں نے دہلی کے مسلم سلاطین کی ماتحتی قبول نہیں کی۔ اسی طرح انگریزوں کے دور میں بھی وہ برابر بغاوت کرتے رہے۔ ایسی حالت میں حکومت پاکستان کا یہ سوچنا بالکل درست تھا کہ ان کو مجموعہ کی شکل میں بسانا ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ وہ یہاں بھی شورش برپا کرتے رہیں گے۔

..یہی وہ صورت حال ہے جس کے بارہ میں حضرت مسیح نے فرمایا کہ ـــــ انھیں دوسرے کی آنکھ کا تنکا دکھائی دیتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (فیصل آباد) کا ٹیلی فون آیا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فیصل آباد کے سفر سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ وہ خود لاہور تشریف لائے۔ ان سے موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کے موضوع پر گفتگو رہی۔ اس مجلس میں روزنامہ وفاق کے اڈیٹر جناب مصطفی صادق صاحب اور بعض دوسرے حضرات بھی موجود تھے۔

ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میری رائے اس سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر آپ نے سنا ہوگا۔ لوگ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق ہمیشہ ظلم و ستم کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ یا تو تحریف (Distortion) ہوتی ہے یا تعمیم (Generalization) یعنی یا تو کسی واقعہ کو بگاڑ کر غلط شکل میں پیش کیا جاتا ہے یا کسی اتفاقی واقعہ کو عمومی حالت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنا نقطہ نظر نہایت تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس کا نام ہے "حل یہاں ہے"۔

پاکستان کے لئے روانگی سے چند دن پہلے میں نے ایک اخبار میں ایک بیان پڑھا تھا۔ یہ پاکستان کی سابق مجلس شوریٰ کی خاتون رکن بشریٰ رحمان کا بیان تھا۔ اس بیان میں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

ہندستان کے مسلمان ثقافتی شدھی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی

حالت اتنی زیادہ خراب ہے کہ مسلمانوں کو وہاں باعزت روزگار حاصل کرنے کے لئے ہندو نام رکھنے پڑتے ہیں۔ ان کو ہندوؤں جیسی وضع قطع اختیار کرنی پڑتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس طرح کے جھوٹے بیانات دینے میں بہت سے مذہبی رہنما بھی عام لیڈروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی نے ایک بار ہندستان کے مسلمانوں کو اسرائیل کے عربوں کے مشابہ بتایا۔ میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کس خانہ میں ڈالوں۔ کیوں کہ اس قسم کے تبصرہ سے قائل کی سنجیدگی مشتبہ ہو رہی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۵۹ میں عرب دنیا کا سفر کیا تھا۔ ان کے ہمراہ ان کے رفیق خاص محمد عاصم صاحب بھی تھے جنھوں نے واپسی کے بعد "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے اس سفر کی تفصیلی روداد شائع کی۔ یہ روداد ۱۹۶۲ میں لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور محمد عاصم صاحب نومبر ۱۹۵۹ میں سمندری جہاز کے ذریعہ کراچی سے بحرین پہنچے۔ یہاں کی روداد کا ایک حصہ کتاب میں ان الفاظ میں درج ہے:

> (بحرین میں) مولانا مودودی لوگوں کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت موثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی تو شاید وہ اتنی موثر نہ ہوتی۔ بعض لوگوں نے پاکستان کے موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی سوالات کئے لیکن مولانا نے ان کا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں پاکستانی سیاسیات کو کراچی کے ساحل پر بطور امانت رکھ آیا ہوں۔ اور جب واپس جاؤں گا تو اسے وصول کرلوں گا۔ اس لئے آپ لوگ اس کے متعلق مجھ سے سوالات نہ کریں (صفحہ ۲۳)

حیران کن بات یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خود اپنے ملک کے بارہ میں تو جانتے تھے کہ اس کی بابت باہر انھیں خاموش رہنا ہے۔ مگر یہی بات وہ ہندستان کے نازک تر مسئلہ کے بارہ میں نہیں جانتے تھے۔ کیسا عجیب تھا ان کا جاننا اور کیسا عجیب تھا ان کا نہ جاننا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ——— ۱۰

مصر سے ہم کو اخبار الاہرام (قاہرہ) کے سات تراشے موصول ہوتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ مشہور عربی ادیب ڈاکٹر احمد بہجت نے متواتر ایک ہفتہ (۱۱ اپریل تا ۱۷ اپریل ۱۹۸۵) تک اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں تائیدی مضامین شائع کئے۔ ان عربی مضامین کے عنوانات یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

المشروع	الاہرام	۱۱ اپریل ۱۹۸۵
ضعفنا لاقوتہم	″	۱۲ ″ ″
معنی القوۃ	″	۱۳ ″ ″
التغیرات الجدیدۃ	″	۱۴ ″ ″
الجلاد بالدمار	″	۱۵ ″ ″
نموذج آخر	″	۱۶ ″ ″
البدایۃ	″	۱۷ ″ ″

۲. مئی ۱۹۸۵ میں صدر اسلامی مرکز نے آسنسول کا سفر کیا۔ یہاں ۲-۳ مئی کے درمیان موصوف کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ ان اجتماعات کا انتظام مدرسہ مصباح العلوم آسنسول نے کیا تھا۔

۳. ۴ مئی ۱۹۸۵ کو صدر اسلامی مرکز کلکتہ میں تھے۔ یہاں اسلامیہ ہال میں موصوف کی ایک تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا " اسلام اور عصر حاضر " اس اجتماع کا انتظام مدرسہ باب العلوم کلکتہ نے کیا تھا۔

۴. ۱۶ — ۱۹ مئی ۱۹۸۵ کو بمبئی میں صدر اسلامی مرکز کا چار روزہ پروگرام تھا۔ اس دوران بمبئی کے مختلف حصوں میں موصوف کے خطابات ہوئے۔ اس کا انتظام حلقہ الرسالہ بمبئی کی طرف سے کیا گیا تھا۔

۵. الرسالہ کیسٹ کا سلسلہ یکم جولائی ۱۹۸۵ سے شروع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ ماہانہ سلسلہ کے طور پر جاری رہے گا۔ ہر کیسٹ صدر اسلامی مرکز کی دو تقریروں پر مشتمل ہوگا۔ اور ہر تقریر ۳۰-۳۰ منٹ کی ہوگی۔

۶. ایک صاحب لکھتے ہیں: شہر کے ایک اسکول ماسٹر کو میں نے اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ اپنے

بیگ میں الرسالہ کے کچھ شمارے رکھیں اور لوگوں کو یہ بتا کر دیں کہ یہ عصری اسلوب میں اسلام کی دعوت ہے۔ اس طرح الرسالہ اردو اور الرسالہ انگریزی کے ممبر بنائیں۔ الحمد للہ یہ کوشش کامیاب رہی۔ چند ہی دنوں میں انھوں نے الرسالہ کے دس ممبر بنالئے۔ اور دوسری کئی چھوٹی کتابیں ان کے ذریعہ لوگوں نے حاصل کیں۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ایجنسی میں اضافہ کے لئے لکھا تھا۔ اب ممبروں کے بڑھنے سے مزید اضافہ ضروری ہوگیا ہے۔ براہ کرم اب آپ ہماری ایجنسی میں ہر ماہ ایک سو پرچے روانہ کریں۔ یہ سب کچھ ہم لوگ اللہ کے لئے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہوجائے آمین"۔ یہ مثال ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے۔ الرسالہ کی اشاعت میں اضافہ کے لئے یہ طریقہ بہت کامیاب ہے۔

الرسالہ کس طرح ہر حلقہ میں مقبول ہو رہا ہے۔ اس کی مثال روزانہ سامنے آتی رہتی ہے۔ یہاں ہم شری منگل سین کا خط مورخہ ۴ اپریل ۱۹۸۵) کا ایک حصہ نقل کر رہے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں: آپ کا ماہنامہ الرسالہ باقاعدگی سے دستیاب ہو رہا ہے۔ اور جب یہ پہنچتا ہے تو سارے کام چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کسی سے بات چیت ہو رہی ہو تو فوراً ختم کر کے اس کو پڑھنا شروع کر کے تسکین ملتی ہے۔ بلاشبہ خدا نے آپ کے قلم میں وہ روانی عطا کی ہوئی ہے کہ جس سے ہمارے پاٹھکوں کو تو بہت آنند آتا ہے۔ گویا یہ تحریر کسی خدا شناس کی تحریر معلوم پڑتی ہے۔

الرسالہ (انگریزی) کے ایک امریکی قاری نے ایک مفصل خط لکھا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں:

> Your journal (*Al-Risala* monthly) has been arriving, but I have not known what to write. The journal is interesting and well-written. It shows a great deal of insight and an extensive knowledge of Islamic history, and a fine moral sense.

انگریزی زبان میں دو کتابوں کا ترجمہ تیار ہے۔ اور ان شاء اللہ جلد ہی پریس میں جائے گا۔ یہ دونوں کتابیں یہ ہیں: پیغمبر انقلاب، اسلام دین فطرت۔ ان کے علاوہ انگریزی کے اور بھی کچھ ترجمے تکمیل کے مرحلے میں ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متنوع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱. الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲. زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳. کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴. صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵. ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی انشاءاللہ یکم جولائی سے شروع ہوگی

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

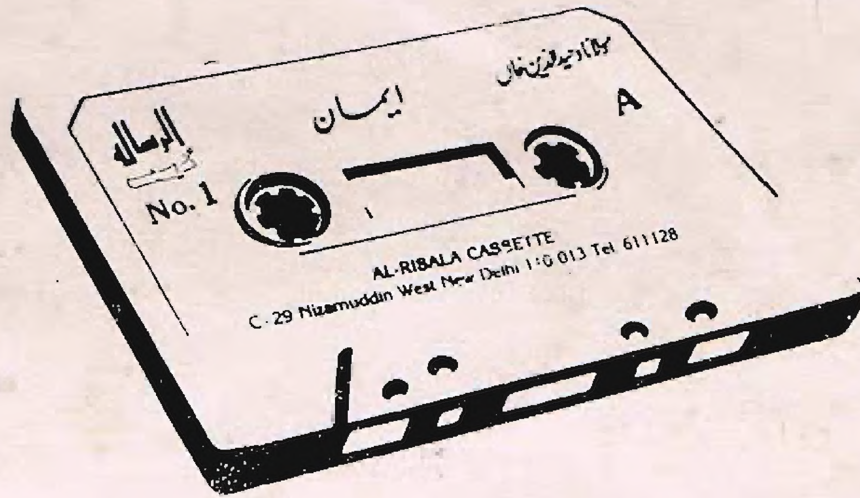
July 1985
Number 104

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ
کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز



عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحیدالدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ — بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی

ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ — ۲۵ ڈالر امریکی

سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ — ۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں
الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs 3.00